Regd. L. No. 7243 Phone. 80S[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1975

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپکو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (قائد اعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs 35.00 Paper back - Rs. 20.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,

25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH

Chowk Urdu Bazar. LAHORE

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
(1½) ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور	پاکستان: سالانہ — پندرہ روپے؛ غیر ممالک: سالانہ — ڈیڑھ پونڈ
نمبر ۳	مارچ ۱۹۷۵ء	جلد ۲۸

فہرست

۱۔ لمعات —— ۲

۲۔ کشف و الہام —— (محترم پرویز صاحب) —— ۹

۳۔ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ —— ۱۸

۴۔ حقائق و عبر —— (وحی کی آواز) —— (یہ کونسے قرآن میں ہے؟) —— ۲۴
(اخذ از آئینہ ادارہ اسلام)

۵۔ مساواتِ اسلامیہ —— (محترم سید علی نقی النقوی صاحب) —— ۲۸

۶۔ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے! —— (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب) —— ۳۳

(۷) ... مگر تو بیرا نہ سامنے! —— (چوہدری عطا راشد صاحب) —— ۴۲

(۸) مجلس مذاکرہ (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء) —— ۴۹

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ملا لاہور۔ پرنٹر: شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(۱) سیکولرازم - پاکستان میں

ہمارے دور میں اسلام کا اولین حریف سیکولرازم کا نظریہ اور مسلک ہے۔ سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کوئی ابدی اور غیر متبدل اقدار و قوانین نہیں۔ اقدار و قوانین سوسائٹی متعین کرتی ہے جو وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی ثبات و تغیر کے اصول کے تابع قائم رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ وحیٔ خداوندی وہ حدود و اصول متعین کرتی ہے جو غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے قوانین و ضوابط وضع کئے جا سکتے ہیں جو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل، ابدی اصول و اقدار، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ مملکت پاکستان، اسلامی ہونے کی مدعی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں، ثبات و تغیر کا اصول کارفرما ہوگا۔ اس کے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت اپنا تمام کاروبار، خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ اس کے باوجود، یہاں اٹھتے بیٹھتے سیکولرازم کا پرچار ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً ابھی حال میں، پاکستان ٹائمز میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

> قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک ذرۂ ناچیز سے لے کر بڑے سے بڑے کرۂ فلکی تک حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں۔ ہم بھی، جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرا سے گوشے کے مکین ہیں، اسی قانونِ تغیر کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں۔ (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گزشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔
>
> شیکسپیئر نے کہا تھا، "خیر اور شر فی ذاتہٖ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے، کسی کو شر۔ (جیسا ہم خیال کریں وہ شے ویسی ہی ہو جاتی ہے)۔ حق اور باطل، غلط اور صحیح — قانونی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے — اضافی ہیں۔ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصورِ حق و باطل اور خیر و شر سوسائٹی کے ساتھ ساتھ

> بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے، سوسائٹی کے معیار کی رُو سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ــــ بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روکے رکھے ــــ اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کو نگاہ میں رکھے۔ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

(اس مقالہ کے نگارندہ ہیں، پاکستان کے سابق چیف جسٹس، محمد منیر صاحب، اور یہ شائع ہوا ہے پاکستان ٹائمز کی ۱۰ جنوری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں، جو پریس ٹرسٹ کے زیر تولیت ہے۔ یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ نظریۂ حیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام تو ایک طرف، نظامِ فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بڑی سطحی اور ناقص ہیں۔ وہ اگر کسی عام سائنس دان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے، اور تغیرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ سرما میں وہ بالکل ٹھنڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں ابھرتی ہیں۔ غنچے چٹکتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانونِ نشوونما کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ان قوانینِ فطرت میں جن کی بنیادوں پر اس محیر العقول کارگہ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیر بھی آ جائے تو سارا سلسلۂ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبعی زندگی پر غور فرمائیں۔ زندگی کا مدار تنفس (سانس لینے) کے قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کیلئے بھی اس قانونِ حیات میں تغیر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے "تغیر" سمجھتے ہیں کہ عام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے، سمندر کی تہ میں، یا چاند کی سطح پر اسے آکسیجن کا بیگ اپنی کمر پر لادنا پڑتا ہے، اور مریض کو آکسیجن ٹینٹ میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قانونِ زندگی کے تغیرات نہیں، یہ اس قانون پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع و اسباب ہیں۔ ذرائع و اسباب حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے، قانون ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ یہ ہے نظامِ فطرت۔

انسان کی تمدنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کے لئے بھی قوانین کی ضرورت ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے عطا ہوتے ہیں، غیر متبدل رہتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قوانین، خیر و شر اور حق و باطل کا معیار ہیں۔ منیر صاحب اپنے دعوے کی تائید میں شیکسپیئر کا قول پیش کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا تبدیل لکلمات اللہ ــ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔ "مذہب پرستوں" کا خدا کے اس ارشاد پر ایمان ہے جس کی تائید کائنات کا سارا نظامِ فطرت کر رہا ہے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منیر صاحب اپنے دعوے کی تائید میں علامہ اقبال کی

پیش فرما رہے ہیں، لیکن اسی طرح جس طرح انہوں نے نظام فطرت کو اپنی تائید میں پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مندرجہ بالا دعوے کے بعد خطبات اقبال سے حسب ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر دو جیسے متضاد عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (کہ انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصور نہیں) علامہ اقبال کا مندرجہ صدر بیان پیش فرمایا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نۂ، دلبرا خطا اینجاست

جس طرح وہ نظام فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس میں کس طرح غیر متبدل قوانین کار فرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اقبال کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے۔ علامہ اقبال، ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصول حیات قرار دے رہے ہیں۔ وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے۔ چنانچہ وہ (جتنا اقتباس منیر صاحب نے درج کیا ہے) اس کے بعد کہتے ہیں کہ:-

> یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

اب منیر صاحب ہمیں سبق دے رہے ہیں کہ تم بھی "غیر متبدل" کے چکر سے نکل کر یورپ کی تقلید کرو، تاکہ جس طرح وہ ناکام رہا ہے، تم بھی ناکام ہو جاؤ۔ بیچارہ مظلوم پاکستان بھی کس عذاب میں مبتلا ہے؟ ایک طرف ملا ہے جو مصر ہے کہ تم آسمان کو شیشے کا دیو ہیکل گنبد سمجھو جس میں ہیرے اور جواہرات ٹکے ہوتے ہیں اور وہ رات کے وقت چمکتے ہیں۔ سند اس کی یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا کہہ گئے ہیں ۔۔۔ دوسری طرف ہمارے یہ قانون دان اور دانشور ہیں جو یہ تلقین فرماتے ہیں کہ تم وحی کے عطا کردہ ابدی اور غیر متبدل اصولوں کی توہم پرستی کو چھوڑو، اور یورپ کی تقلید کرو ۔۔۔ سند اس کی یہ کہ شیکسپیر ایسا کہہ گیا ہے ۔۔۔ چکی کے ان دو پاٹوں میں یہ مملکت پس رہی ہے

اور اس کی وجہ یہ کہ خود اربابِ مملکت اسے ایسا رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مُلّا کو بھی دانہ ڈالتے رہتے ہیں، اور مغرب زدہ دانشوروں کو بھی تھپکی دیتے رہتے۔ انہوں نے آئین میں یہ شق رکھ چھوڑی ہے کہ مملکت اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ لیکن اس نے آج تک یہ متعین کیا ہے کہ یہ "حدود اللہ" کیا ہیں، نہ یہ دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کہ مملکت کا کاروبار ان حدود کے اندر سرانجام پا رہا ہے یا ان سے تجاوز کر کے۔ یہاں قولاً اسلام کی حکومت ہے اور عملاً سیکولرازم کی۔ پھر اگر جناب منیر یہ کچھ فرمائیں اور ان کی نگارشات پاکستان ٹائمز میں شائع ہوں تو اس میں کون سی تعجب انگیز بات ہے!

———(۰)———

۲۔ اقبالؔ کا جشنِ صدسالہ

اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق، ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبالؒ کے یومِ پیدائش کی صدسالہ تقاریب منعقد کی جائیں گی اور ان کا اہتمام خود حکومت کی طرف سے (یا اس کی زیرِ نگرانی) ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ مختلف مفکرین سے فکر و پیامِ اقبالؒ کے مختلف گوشوں کے متعلق تحقیقاتی مقالات اور کتابیں مرتب کرائی اور شائع کی جائیں۔ یہ تجویز بڑی مبارک ہے اور مستحقِ تائید و تحسین۔ ان مقالات و تصانیف کے سلسلہ میں کون کون سے موضوعات تجویز کئے گئے ہیں۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن ایک تجویز پیش کرنے کی جسارت ہم بھی کرتے ہیں۔

فکرِ اقبالؒ کی بنیاد آن کے فلسفہ خودی پر ہے۔ ان کا پیغام بھی اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد ان کے متعلق ہزاروں مقالات اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں، اقبالؒ کی پیش کردہ "خودی" کی خصوصیات اور اس پر یقین رکھنے کے نتائج سے تو بحثیں کی گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں، کسی نے علمی سطح پر یہ نہیں بتایا کہ خودی ہے کیا، یا اس کا فی الواقعہ کوئی وجود ہے بھی یا اسے محض عقیدۃً مانا جاتا ہے۔ یوں تو یہ سوال شروع ہی سے بڑا اہم تھا لیکن اب اس کی اہمیت اور بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

خودی پر یقین رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان اس کے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں، جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس سے یہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس "شے" کو اس کی ذات، یا نفس، یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کا ارادہ اور نیت تک اس "شے" پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موت سے انسان کا جسم تو ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ شے باقی رہتی اور اعمالِ انسانی کے ان اثرات و نقوش کو ساتھ لئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے مستقبل کا تعین، انہی اثرات و نقوش کی رو سے ہوتا ہے۔

مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب و تعلیم، اس شے کے وجود سے انکار کرتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان صرف اپنے طبیعی جسم سے عبارت ہے جس کے خاتمے سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ فرد اور اس کے اعمال و افعال کا

تعلق اس کے معاشرہ سے ہے' اور بس۔ یورپ میں یہ خیال پہلے بھی عام تھا لیکن سوشلزم کے فلسفے نے اس پر ایک اور تازیانہ لگایا ہے' اور اب یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا اور سیلاب کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ اس کے شکوک کا ازالہ نہ مدرسہ سے ہوتا ہے نہ مکتب سے۔ اقبالؒ' جو تہذیبِ مغرب کا اس قدر مخالف اور "مکتب و مدرسہ" (یعنی ہمارے دنیاوی اور دینی نظامِ تعلیم) سے اس قدر نالاں تھا تو اس کی وجہ یہی تھی۔ ہمارے ہاں کوئی کتاب ایسی نہیں جس سے ان نوجوانوں کو علومِ عصرِ حاضر کی روشنی میں' خالص فکری سطح پر سمجھایا جا سکے کہ یورپ کا یہ نظریہ غلط ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اقبالؒ کی صد سالہ تقاریب کے سلسلہ میں' اس قسم کی کتاب مرتب کرائی اور شائع کی جائے۔

اس قسم کی کتاب کی تالیف و اشاعت اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کے سمجھنے کے لئے ہی ضروری نہیں' خود اسلام کا بھی یہ تقاضا ہے۔ دین کی ساری عمارت' قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس قانون کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل اور ارادہ (قرآن کے الفاظ میں' اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں تک) قانونِ خداوندی کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے' اور اس کا نفس ان نتائج کا متحمل ہوتا ہے۔ موت کے بعد یہ نفس آگے بڑھتا ہے۔ اور اس زندگی میں اس کے اعمال کے نتائج کے مطابق اس کا مقام متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کے تعمیری نتائج کا پلڑہ بھاری ہوتا ہے تو اس کا نفس مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے حیاتِ اُخروی میں جنت کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ پلڑہ ہلکا' اور تخریبی نتائج کا پلڑہ بھاری ہوتا ہے' تو اس کا ارتقاء رک جاتا ہے۔ اسے جہنم کہا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ نفس (یا اقبالؒ کے الفاظ میں خودی) پر ایمان کس طرح دین کی عمارت کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ ایمان بالآخرت کے بغیر دین کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ ہمارا نوجوان طبقہ اس ایمان و ایقان سے محروم ہوتا جا رہا ہے' اور اسی کی وجہ سے اسلام سے برگشتہ۔ اسلام ہی سے برگشتہ نہیں' بلکہ وہ ہر اخلاقی قدر سے دور ہٹتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ جب تصور یہ ہو کہ زندگی صرف طبیعی جسم کی زندگی ہے تو پھر معاشرہ کے قوانین و ضوابط سے بلند کسی قدر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی۔ اس وقت (پاکستان ہی نہیں بلکہ) ساری دنیا میں جو بلند اقدار سے سرکشی عام ہو رہی ہے تو اس کا بنیادی سبب ایمان بالآخرت کا فقدان ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں یہ ایمان اندھی عقیدت کی بنا پر پیدا نہیں کیا جا سکتا——اندھی عقیدت کا زمانہ گزر چکا ہے۔ وہ اسے علیٰ وجہ البصیرت سمجھنا چاہتے ہیں یعنی اس طرح ایمان لانا چاہتے ہیں جس طرح قرآن نے بتایا ہے۔ قرآن' اس عقیدہ کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا جسے علیٰ وجہ البصیرت تسلیم نہ کیا جائے۔ وہ مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور خود) آیاتِ خداوندی بھی لائی جائیں' تو یہ ان کے آگے بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک جاتے"۔ ایمان علیٰ وجہ البصیرت نہ "مدرسہ" میں نصیب ہو سکتا ہے نہ "مکتب" میں۔ یہ دونوں تقلید کے پھندے میں جکڑے ہوتے ہیں۔ مدرسہ (دنیاوی تعلیم کا مرکز) تقلیدِ مغرب میں اور مکتب (مذہبی تعلیم کی آماجگاہ) تقلیدِ آبا میں۔ اپنی فکر کے دروازے دونوں کے

بال بند ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس قسم کی کتاب کی ترتیب و اشاعت جو علیٰ وجہ البصیرت ایمان بالآخرت کے لئے ممد و معاون بن سکے خود اسلام کا تقاضا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان نوجوانوں کو خودی (انسانی نفس) کے اثبات، ممکنات اور مستقبل کے متعلق بلند علمی سطح پر سمجھایا اور بتایا جائے۔ اگر اقبال ؒ کے جشنِ صد سالہ کے منتظمین اس کا انتظام کر سکیں تو اس سے نہ صرف اقبال ؒ کی وہ آرزو پوری ہو جائے گی جسے وہ اپنے ساتھ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے (یاد رہے کہ علامہ اقبال، مطالبِ قرآن کے موضوع پر خود ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو پورا نہ ہو سکا) بلکہ خود اسلام کا بھی ایک بہت بڑا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر جو کچھ ہو گا محض ایک رسم کی ادائیگی یا "شاعری" ہو گی — جیسا کہ اس وقت تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ یہ حضرات ہماری اس عرضداشت کو درخورِ اعتنا قرار دیں گے۔؟

مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی

۱۷ر جنوری ۱۹۷۵ء کو انتقال کر گئے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اس لئے دنیا بھر کے اربابِ نظر نے انہیں خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا، حتّٰی کہ ملکۂ برطانیہ تک نے پیغامِ تعزیت بھیجا لیکن فنی شہرت کی اس قدر بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود یہ حقیقت ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہی کہ

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن — ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

اسی کا نتیجہ تھا کہ حضور رسالتمآبؐ کی محبت سے ان کا قلب گداز، اور قرآن مجید کے ساتھ والہانہ وابستگی سے ان کا سینہ روشن تھا۔ میرے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات کی یہی بنیاد تھی۔ وہ میری پیش کردہ فکرِ قرآنی کے دلدادہ تھے۔ میری تصانیف کے بشیتر گرد پوشوں کی جدولیں انہی کے موئے قلم کی رہینِ منت ہیں۔ ان ہیں (ان کی آخری یادگار — شاہکارِ رسالتؐ کی فردوسِ نظر جدول ہے۔ وہ خلوت پسند تھے — کہ فن میں جذبِ انہماک کا یہی تقاضا ہوتا ہے — لیکن طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ ۱۹۷۳ء کے میرے خطابات میں سے ایک کا موضوع تھا — آرٹ اور اسلام — اس اجلاس کی صدارت کے لئے وہ بصد ذوق و شوق تشریف لائے، اور اپنے پیغام سے سامعین کو نوازا۔

قرآن مجید سے ان کے عشق کا نتیجہ تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی عزیزہ مسرت سلطانہ نے مجھ سے قرآن پڑھا۔ اس نے نہایت ممتاز حیثیت سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ (علامہ اقبال ؒ کے الفاظ میں) "زندانیٔ برگساں" نہیں ہوئی — دامنِ افلاک نہ باپ کے ہاتھ سے چھوٹا نہ بیٹی کے ہاتھ سے۔

دعا ہے اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے سحابِ کرم کے سایہ میں رکھے اور پسماندگان کو توفیقِ صبر عطا کرے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

دعا گو — پرویز

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

یہ بدنصیب ملک، فساد و خونریزی کی جس لہر میں گرفتار ہو رہا ہے، اس کا حالیہ تلاطم سانحۂ پشاور کی ہولناک شکل میں رونما ہوا۔ اس میں صوبہ سرحد کے ممتاز مدبر حیات محمد خان شیرپاؤ اور زخمی طلباء میں سے ایک طالب العلم جاں بحق ہو گئے کچھ ابھی زیر علاج ہیں (اللہ تعالیٰ انہیں زندگی عطا فرمائے)۔ ہماری مملکت اسلامی کہلاتی ہے اور یہاں کے رہنے والے مسلمان۔ جس کتاب خداوندی کی طرف نسبت سے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اس کا ارشاد یہ ہے کہ جس شخص نے کسی ایک متنفس کو بھی ناحق قتل کر دیا، فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲) یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو قتل کر دیا۔ اور مسلمانوں کو جس کی تنذیر یہ ہے کہ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳) جس نے کسی ایک مسلمان کو بھی بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی۔ خدا نے اس کے لئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ایسے ملک اور ایسی قوم میں اس قسم کے قتل ناحق کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نہ ہمارا خدا پر ایمان ہے، نہ اس کی کتاب کا کوئی احترام۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ صرف ہم خدا کے غضب میں گرفتار ہیں بلکہ ہماری وجہ سے دنیا میں اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے۔ ہمیں اس جرم کی سزا بھی تو مل رہی ہے۔

سانحۂ پشاور کی تحقیق ہو رہی ہے اور مجرموں کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیئے کہ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ (۲/۱۷۹)۔ قوم کی زندگی کا راز قانون کی محکم گرفت اور عدل کی بے رو رعایت کارفرمائی میں پوشیدہ ہے۔ لیکن بات اسی بہیمانہ قتل کی نہیں۔ یہاں قتل و غارت گری قوم کا مزاج بنتا جا رہا ہے اصل سوال اس جنون کے علاج کا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے جس میں ملک کا کثیر طبقہ مبتلا ہو رہا ہے۔ اور جب تک اس مرض کا علاج نہیں کیا جائے گا، ملک میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ سانحات و حادثات کے وجوہ انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اور سیاسی بھی۔ لیکن جب یہ مرض ایک وبا کی شکل اختیار کر جائے تو اس کے اسباب کی بنیادیں بڑی گہری ہوتی ہیں اور انسانی نفس کی تہوں میں پیوستہ۔ ان اسباب کی تحقیق و تشخیص بڑے گہرے مطالعہ اور فکر و تدبر کی محتاج ہوتی ہے اور اس کے علاج کا مرحلہ بڑا ہمت طلب اور صبر آزما۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم موجودہ ہنگاموں کی اثر پذیری سے الگ ہٹ کر ان اسباب و وجوہ کی تحقیق کریں اور ان کے ازالہ اور تدارک کی فکر۔ یہ چیز قوم میں نفسیاتی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور نفسیاتی تبدیلی، صحیح تعلیم و تربیت اور ایسے مساعد ماحول کے بغیر ناممکن جس میں نہ کوئی فرد کسی قسم کا خوف و حزن محسوس کرے اور نہ ہی بیم و رجا کی کشمکش میں گرفتار رہے۔ قرآن کریم ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

کشف والہام

(پرویز)

میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آرہا ہوں کہ کشف والہام کے عقیدہ سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم سے اس کی کوئی سند اور شہادت نہیں ملتی، اور یہ دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے میرے اس پیش کردہ نظریہ کے خلاف کوئی ردِ عمل نہ ہوا، لیکن اب جو میں نے اپنی کتاب ـــ ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں اسے دہرایا اور بتایا کہ مرزا غلام احمد کس طرح انہی سیڑھیوں سے بتدریج دعوئے نبوت تک پہنچ گئے تو "احمدی" حضرات کی طرف سے اس کے خلاف خاص ردِ عمل ہوا۔ انہوں نے اس کے خلاف مضامین بھی شائع کئے اور مجھے خطوط بھی لکھے۔ ان کے "دلائل" کا ملخص یہ ہے کہ بڑے بڑے صوفیائے کرام اور اولیاءِ عظام نے کشف و الہام کے دعوے کئے ہیں۔ اگر اس قسم کے دعوے کی بنا پر مرزا صاحب کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا ہے تو یہ فرمائیے کہ ان بزرگوں (حضرات صوفیاء اور اولیاء) کے متعلق آپ کیا کہیں گے (طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء) میں ان کے اس اعتراض کو واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ میں نے ان میں سے بعض حضرات کے خطوط کا نجی طور پر جواب دیا، لیکن چونکہ یہ اس اعتراض کی اشاعت عام کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے عوام چھوڑ، خواص تک کا بھی مطالعہ ایسا وسیع نہیں کہ وہ از خود حقیقت تک پہنچ جائیں، اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ ان کی اس مغالطہ آفرینی کی کوششوں کی نقاب کشائی کر دی جائے۔

وحیِ خداوندی اور علمِ انسانی میں بنیادی فرق کے متعلق میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر بالتفصیل لکھ چکا ہوں۔ اس جگہ اسے مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس کا طریقہ، مشاہدہ، تجربہ، مطالعہ، افہام و تفہیم، تعلیم و تعلم، درس و تدریس وغیرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان کے حواس (SENSES) خارج سے کچھ معلومات حاصل کر کے انہیں ذہن تک پہنچاتے ہیں اور وہ ان پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ یہ اس فرد کا حاصل کردہ علم ہے۔ افرادِ انسانیہ از خود بھی اس طرح علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کے حاصل کردہ علم سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ انسانوں کے لئے حصولِ علم کا یہی طریق ہے۔ اصطلاح میں اسے ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی ادراک بالحواس ہی کو علم قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ

وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۔ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو۔ اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔ یاد رکھو' تمہاری سماعت، بصارت اور عقل و فکر ہر ایک سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔" دوسری جگہ، ان ذرائع علم (حواس) سے کام نہ لینے والے کو جہنمی اور حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ جو کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ (۷/۱۷۹) یہ لوگ' انسان نہیں' حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے بھی ذرائع حصولِ علم' حواس ہیں۔

لیکن اس نے اس باب میں ایک استثناء بتائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک علم وہ بھی ہے جسے خدا اپنے منتخب بندوں کو براہ راست عطا کرتا تھا۔ یعنی اس میں' اس شخص کی' جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا، سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ علم ادراک بالحواس نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ جس برگزیدہ انسان کو یہ علم عطا کیا جانے والا ہوتا تھا۔ اُسے' اس سے ذرا پہلے' اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے۔ اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا' اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ یہ علم (وحی) آخری مرتبہ' حضور نبی اکرمؐ کو عطا ہوا اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ سلسلۂ وحی کے اس طرح بند کر دیئے جانے کو ختمِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ادراک بالحواس رہ جاتا ہے۔ اسی علم کے ذریعے خود قرآن کریم پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں ذرائع علم (یعنی وحی اور ادراک بالحواس) کو نہایت واضح اور متعین طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اس نے نہ کسی اور ذریعہ علم کا ذکر کیا ہے' نہ امکان بتایا ہے۔

اہل کتاب کے ہاں وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو اُن کے انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی خدا کی طرف سے ملی تھیں۔ جن کتابوں کو وہ آسمانی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں' ان میں' وحی کا واضح اور منزہ تصور نہیں ملتا۔ نہ ہی نبوت یا نبی کا متعین مفہوم سامنے آتا ہے۔ (مثلاً) یہودیوں کے ہاں حضرت موسیٰؑ کو بھی نبی مانا جاتا ہے اور یرمیاہ، دانیال، حزقیل وغیرہ کو بھی نبی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان کی طرف منسوب صحائف بھی عہد نامہ عتیق میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات ہیکل میں کہانت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ کہانت سے مفہوم تھا پیشین گوئیاں کرنا۔ اور لوگوں کی قسمت کا حال بتانا۔ انگریزی زبان میں نبی کا ترجمہ (PROPHET) اسی اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ یعنی پیشین گوئیاں (PROPHECIES) کرنے والا۔ بعد میں' جب یہودیت میں تصوف (MYSTICISM) (یا باطنیت (یعنی داخلی واردات) ذریعۂ علم قرار پا گیا اور اس طرح ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہو گیا۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ مانتے تھے اس لئے ان کے ہاں بھی نبی یا وحی کا تصور واضح نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے سوانح حیات' ان کے شاگردوں (متی، لوقا، مرقس وغیرہ) نے مرتب کئے تو انہیں رسول کہہ کر پکارا گیا۔ ان میں یوحنا (ST. JOHN) کی انجیل کو خاص طور پر (REVELATION) قرار

دیا گیا۔ اور اس کا ترجمہ "مکاشفہ" کیا گیا۔ ان مرتبین اناجیل کے بعد ان کے ہاں (SAINTS) ۔ اولیاء۔ کا سلسلہ جاری ہوا۔ جن کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ انہیں خدا کی طرف سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یوں ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہوا۔

نزولِ قرآن کے وقت، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں، وحی کا تصور بڑا مبہم لیکن کشف و الہام کا عقیدہ عام تھا۔ جگہ جگہ ان کے کاہن اور ولی مرکزِ عوام تھے جو باطنی علم رکھنے کے مدعی تھے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے)، قرآن کریم نے وحی کا نہایت واضح اور متعین تصور دیا، اور اس کے سوا خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کے ہر عقیدہ کو ختم کر دیا۔ وحی کے بعد علم صرف ادراک بالحواس کو قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صدرِ اول میں جب اسلام اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں موجود اور نافذ العمل تھا، کشف و الہام کے الفاظ تک کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ ہی امتِ مسلمہ میں سے کوئی اس کا مدعی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب اسلام میں غیر قرآنی تصورات، نظریات اور معتقدات کی آمیزش شروع ہوئی تو تصوف نے بھی ہمارے ہاں جگہ پالی۔ اور اس طرح کشف و الہام کا عقیدہ بھی وجود میں آ گیا۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، ابوہاشم عثمان بن شریک تھا۔ جس نے ۱۵۰ھ میں رملہ کے قریب پہلی خانقاہ قائم کی۔ ابوہاشم رہنے والا تو کوفہ کا تھا لیکن وہ نقلِ مکانی کر کے فلسطین میں آ بسا تھا جو عیسائیوں کی خانقاہوں کا مرکز تھا۔ اس نے انہی سے یہ تصور لیا اور مسلمانوں میں مسلک تصوف کی طرح ڈال دی۔ (رملہ فلسطین میں واقعہ ہے) مسلکِ تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ صوفیاء کرام (جنہیں اولیاء اللہ بھی کہا جاتا ہے) خدا سے براہِ راست علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف و الہام کہا جاتا ہے۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے علم کی صرف دو نوعیتیں بیان کی ہیں۔ ایک علم (یا ادراک) بالحواس، اور دوسرے خدا سے براہِ راست حاصل ہونے والا علم۔ اس (موخر الذکر) کو اس نے وحی سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی علم جس کا ذریعہ انسانی حواس نہ ہو، بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست حاصل ہوتا ہے، وحی کی شق میں شامل ہوگا، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ (اس کا الگ نام رکھ لینے سے، وہ وحی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا، اس لئے (حضورؐ کے بعد) یہ دعوے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہو سکتا ہے ایسا سمجھنا عقیدہ ختمِ نبوت کے منافی ہے۔

یہاں سے وہ پیچیدہ سوال سامنے آتا ہے جو ہمارے ہاں سخت الجھن کا باعث بنتا ہے۔ اور جس سے فائدہ اٹھا کر "احمدی" حضرات مغالطہ آفرینی سے کام لیتے اور مرزا غلام احمد کے دعوے کو (صوفیاء کرام کے دعوٰی کی مثل قرار دے کر) عین مطابقِ اسلام ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے، اور بنیادی طور پر اسے سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب قرآن کریم کی رو سے، خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو اس قسم کے علم حاصل ہونے کے دعوے کو کسی صورت میں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف

کیوں نہ کر دی جائے۔ جو بات قرآن کریم کی رو سے غلط ہے، وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی طرف منسوب کر دیئے سے بھی صحیح نہیں قرار پا سکتی۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر ان صوفیائے کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہا جائیگا جنہوں نے اس قسم کا دعوے کیا، یا جن کی طرف اس دعویٰ کو منسوب کیا جاتا ہے۔

جہاں تک منسوب کئے جانے کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف اس قسم کے دعوے کی نسبت غلط ہے۔ اگر وہ حضرات قرآنی تعلیم کا علم رکھتے تھے تو انہوں نے کبھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہوگا۔ ان دعاوی کو ان کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

جن حضرات کے متعلق یہ ثابت ہو کہ انہوں نے فی الواقعہ ایسا دعویٰ کیا تھا، تو ان کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اس باب میں غلط فہمی ہو گئی ہوگی جسے انہوں نے "خدا کی طرف سے براہ راست علم" سمجھا وہ خدا کی طرف سے علم نہیں تھا۔ وہ ان کے اپنے تخیل کے پیدا کردہ تصورات تھے۔ بات یہ ہے کہ تصوف کے پُرمشقت مراقبوں اور ریاضتوں سے، انسانی دماغ کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں طرح طرح کے تصورات ابھرتے ہیں، اور اس شخص کا جس قسم کا عقیدہ ہو، یہ تصورات، وہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے ان کے "باطنی مشاہدات" یا "واردات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں انہیں (HALLUCINATIONS) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میں چاہتا تو اس سلسلہ میں بہت سے اربابِ واردات کے بیان کردہ "باطنی مشاہدات" کی مثالیں پیش کر دیتا۔ لیکن بغرض اختصار، میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک، عیسائیوں کے ایک بہت بڑے ولی (ST. MACARIUS) کا بیان اور دوسرے علامہ اقبالؒ کا تبصرہ۔ اول الذکر کا بیان ہے کہ جو تارک الدنیا زاہد اس قسم کی ریاضتوں کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔

> اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہ نمائی کرتی ہے تا آنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ تکمیلِ نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور آخر الامر وہ خود حقیقتِ مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔

یہ ایک غیر مسلم (عیسائی) اہلِ تصوف کے مشاہدات کی کیفیت ہے۔ لیکن اگر آپ خود اپنے ہاں کے بڑے بڑے صوفیائے کرام کے مشاہدات کے بیانات پڑھیں گے تو وہاں بھی آپ کو یہی کچھ ملے گا۔ ان صوفیائے کرام کے مشاہدات کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے اس مقالہ میں جو اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا۔

ﻟﮧ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، ولیم جیمس کی شہرۂ آفاق کتاب (THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) کا مطالعہ فرمائیں۔

> آجکل کا مسلمان یونانی اور ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور توجہ اس نیلی، پیلی، سرخ، روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ فنائیت — یعنی حقیقت کو اپنے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو — دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے رو بہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

یہ مقالہ کافی طویل ہے جس کے آخر میں وہ کہتے ہیں۔

> نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحتانہ انداز کی اُس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان مدعیانِ کشف و الہام میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو شعبدہ بازی اور فریب کاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اس قسم کے دعوے کر کے لوگوں کو اپنے پھندے میں پھنساتے ہیں۔ لیکن ان میں وہ بھی ہیں جو مراقبوں اور ریاضتوں کے پیدا کردہ تخیلات کو حقائق سمجھ لیتے ہیں اور نہایت دیانت داری سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم و عرفان ہے۔ چونکہ نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے اس لئے ہم ان حضرات کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کے بجائے صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں (جس کی تعلیم ہمیں خدائے تعالیٰ نے دی ہے) کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (2/134) "یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے وقت میں اس دنیا سے چلے گئے۔ جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے۔ جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا"

ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے دعوے کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف تھا اس لئے نہ وہ صحیح قرار پا سکتا ہے، اور نہ ہی حوالے دیا کسی اور کے لئے سند۔ دین میں سند او حجت صرف خدا کی کتاب ہے۔ جو لوگ ان بزرگوں کے کشف و الہام کو مانتے ہیں، ان کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نہیں۔ مسلمانوں میں (قرآنی تعلیم کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے) بے شمار ایسے عقاید اور رسوم رواج پذیر ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ انہی میں یہ عقیدہ بھی شامل ہے۔ یہ ان کی جہالت ہے، وہ کفر و شرک نہیں جس کی بنا پر ایک شخص امتِ محمدیہ کے زمرہ سے کٹ کر

الگ ہو جاتا ہے۔ جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے گی تو اس قسم کے عقاید ختم ہو جائیں گے۔ جاء الحق و زھق الباطل' خدا کا ارشاد ہے۔

(۷)

اب آئیے "احمدی" حضرات کی طرف۔ سب سے پہلے وہ، ان حضرات صوفیاء کرام کے اس قسم کے دعاوی کو پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ جب آپ لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے بعد خدا سے براہِ راست علم حاصل ہو سکتا ہے اور انہیں یہ علم حاصل ہوا تھا، تو مرزا صاحب نے اگر یہ کہہ دیا کہ خدا کی طرف سے اب بھی براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' تو ان کے ایسا کہنے کی بنا پر آپ انہیں کس طرح کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے سکتے ہیں۔ آپ ان کے اس دعوے کو، کہ انہیں بھی اس قسم کا علم حاصل ہوا تھا سچا نہیں ماننے تو نہ مانئے۔ لیکن جو لوگ اسے سچا مانتے ہیں' انہیں آپ کس طرح خارج از اسلام ٹھہرا سکتے ہیں یہ دعوے کہ حضورؐ نبی اکرم کے بعد بھی خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' کس طرح "ختمِ نبوت" کی مہر کو توڑ دیتا ہے۔ اگر اس سے "ختمِ نبوت" کی مہر ٹوٹ جاتی ہے تو آپ ان ہزار ہا صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہیں گے جو اس قسم کے علم کے جاری رہنے کا عقیدہ رکھتے اور اس علم کے حاصل ہونے کے خود مدعی تھے!

یہ ہیں وہ اعتراضات جو ان لوگوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو حضرات اولیاء کرام کے کشف و الہام پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ (اور یہ عقیدہ عام ہے) ان سے ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب نہ بن پڑتا ہے، نہ پڑ سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے (نبی اکرمؐ کے بعد) خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ غلط ہے۔ اس لئے مرزا صاحب اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

اس پر یہ حضرات کہتے ہیں کہ بہت اچھا، مرزا صاحب اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہی سہی، لیکن جو الاؤنس آپ اس قسم کے دعوے کرنے والے حضرات صوفیاء کرام کو دیتے ہیں' وہی الاؤنس مرزا صاحب کو کیوں نہیں دیتے۔ انہیں کیوں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کی اپنی شائع کردہ کتابیں موجود ہیں اس لئے ان کے دعاوی کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ نمعلوم انہوں نے ایسا کہا تھا یا نہیں۔

(۱) ہم نے اوپر کہا ہے کہ اپنے "کشف" کو خدا کی طرف سے براہ راست حاصل ہونے والا علم سمجھنا غلط فہمی ہے جس میں انسان، دیانتدارانہ طور پر بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کے معاملہ میں ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے "الہامات" جس طرح سے شائع کئے گئے اس سے مقصد یہ تھا کہ "لوگ ان کے پیچ میں پھنس جائیں"۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

> "اور یہ الہامات میری طرف سے اگر اس موقع پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے تو وہ ہزار ہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقع پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے ان الہامات پر انہوں

نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر چکے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے اور انہی میں خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا اور جو مسیح کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔

(اربعین ۲۔ صلا۲)

کیا اسے دیانتدارانہ غلط فہمی قرار دیا جائے گا؟

(۲) جو شخص دیانتدارانہ سمجھتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں، وہ (منصور کی طرح) سولی پر چڑھ جائے گا لیکن ان الہامات کے اظہار و اعلان سے مجتنب نہیں رہے گا۔ مرزا صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور کی عدالت میں، زیر دفعہ ۱۰۷ مقدمہ دائر ہوا تو انہوں نے معافی نامہ داخل کر دیا جس میں اس امر کا اقرار کیا کہ وہ آئندہ اپنے الہامات کو شائع نہیں کریں گے

(تریاق القلوب مصنفہ مرزا غلام احمد صلا۳۔ بحوالہ "ختم نبوت اور تحریک احمدیت"۔ صلا۲۹۵-۹۶)

(۳) مرزا صاحب کی ساری اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ ان پر انگریزوں کی حکومت کی اطاعت از روئے اسلام فرض ہے اور جہاد بالسیف حرام ہو چکا ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ اس موضوع پر انہوں نے اس شد و مد سے لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اس سے پچاس الماریاں بھر جائیں۔ وہ ساری عمر "حضور ملکہ معظمہ جناب گورنر جنرل، اور حضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر" کو عرضداشتیں اور محضر نامے بھیجتے رہے کہ انہیں ان خدمات جلیلہ کا صلہ دیا جائے۔ مخالفین سے ان کی حفاظت کی جائے، اس لئے کہ یہ خود ان کا "خود کاشتہ پودا" ہے جس کی حفاظت اور نگہداشت ان کا فریضہ ہے۔

کیا ایسے شخص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیانتدارانہ غلط فہمی کا شکار تھا!

(۴) یہ تو رہا "الاؤنس" نہ دینے کا سوال۔ اب آگے بڑھیے۔ صوفیاء کرام میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہیں بذریعہ الہام، اوامر و نواہی دیئے جاتے ہیں جن پر شریعت متفرع ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ مرزا صاحب ہی کا تھا۔ چنانچہ وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:۔

یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر و نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔　(اربعین ۴۔ صلا)

(۵) صوفیاء کے الگ الگ مسلک ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنا الگ فرقہ نہیں بنایا۔ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ وغیرہ طریقت کے سلسلے ہیں، الگ الگ فرقے نہیں۔ جداگانہ فرقہ کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے۔ اپنی الگ نماز پڑھتے ہیں۔ چشتیہ، قادریہ وغیرہ سلسلے سے منسلک، الگ الگ نماز نہیں پڑھتے۔ سب مل کر نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے برعکس، مرزا صاحب نے، نہ صرف اپنا فرقہ

الگ بنایا، بلکہ جداگانہ اُمت کی تشکیل کی۔ انہوں نے کہا۔

پہلا مسیح صرف مسیح تھا اس لئے اس کی امت گمراہ ہو گئی اور موسوی سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ اگر میں بھی صرف مسیح ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ لیکن میں مہدی اور محمد (صلعم) کا بروز بھی ہوں۔ اس لئے میری امت کے دو حصے ہوں گے۔ ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور یہ تباہ ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ جو مہدیت کا رنگ اختیار کریں گے۔ (الفضل - ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

انہوں نے اپنی اُمت کو حکم دیا کہ وہ کسی "غیر احمدی" کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ کہا:۔

مجھے خدا نے اطلاع دی ہے کہ تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیئے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ (اربعین نمبر ۳ - صفحہ ۳۴ - حاشیہ)

نماز ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ "غیر احمدی" کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ انہیں اپنی لڑکی دینا بھی ناجائز۔ صاحبزادہ بشیر احمد کے قول کے مطابق۔

غرض ہر ایک طریقہ سے ہم کو حضرت مسیح موعود نے غیروں سے الگ کیا ہے۔ اور ایسا کوئی تعلق نہیں جو اسلام نے مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا اور پھر ہم کو اس سے روکا نہ گیا ہو۔ (کلمۃ الفصل)

کیا صوفیاء کرام میں سے کسی نے بھی ایسا کیا ہے؟

(۱) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو میرے الہامات کو نہیں مانتا اور میری بیعت نہیں کرتا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہ "شرف" میرزا صاحب ہی کو حاصل ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ۔

جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیش گوئی موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ اب جو شخص مجھ کو باوصف صدہا نشانوں کے مفتری ٹھہراتا ہے وہ مومن کیونکر ہو سکتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی - صفحہ ۱۶۳)

(۲) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا الہام قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے۔ یہ جرأت مرزا صاحب ہی نے کی کہ۔

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔

(اربعین نمبر ۴ - صفحہ ۱۴)

واضح رہے کہ قادیانی (یعنی ربوتی) اور لاہوری دونوں گروہوں کے "احمدی" مانتے ہیں کہ مرزا صاحب نے تلوار کے جہاد کو منسوخ اور قطعی حرام قرار دیا ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں ملے گی)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں (اور قرار دیئے گئے ہیں) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ مرزا صاحب نے بھی کشف والہام کا دعوٰے اسی طرح کیا تھا جس طرح صوفیائے کرام اور اولیاء عظام اس کا دعویٰ کرتے رہے ہیں، سو اگر وہ حضرات اس دعویٰ کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں پاتے تو مرزا صاحب کو ایسا کیوں قرار دیا گیا ہے، کس قدر تلبیس اور ابلہ فریبی پر مبنی ہے۔

ضمناً، کشف والہام کے سلسلہ میں مجھے جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان میں یہ تقاضا بھی کیا گیا ہے کہ تصوف کے موضوع پر تفصیلی مقالہ شائع کیا جائے جس میں وضاحت سے بتایا جائے کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور مسلمانوں میں یہ کب اور کس طرح مروج ہوا۔ میں اس موضوع پر پہلے ہی کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ میں نے پہلے سلیم کے نام تین خطوط میں اس پر بڑی شرح و بسط سے لکھا اور اب "شاہکار رسالت" میں بھی اس پر بحث کی۔ سلیم کے نام خطوط (اسی نام کی کتاب کی تیسری جلد میں) قریب بیس برس پہلے شائع ہوئے تھے۔ اور شاہکار رسالت، طلوع اسلام کے جملہ قارئین کی نگاہ سے نہیں گزری ہوگی۔ بنا بریں، میں نے مناسب سمجھا ہے کہ کتاب سلیم کے نام خطوط میں سے ایک خط (جس میں اس مسلک کی تاریخ آگئی ہے) طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس کے لئے قارئین انتظار فرمائیں۔

کراچی میں
ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کیلئے
دفتر بزم طلوع اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں۔
پتہ: دار القائد ۳۰۰-۱/بی ناظم آباد (بس سٹاپ) کراچی۔ فون

لاہور میں قیام کیلئے
صاف ستھرے ہوادار کمرے، مناسب شرح پر
نیز عمدہ، لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کیلئے
معیاری طعام گاہ
PARK-WAY
پارک وے ہوٹل
آپ کی تشریف آوری کا مشکور
منیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن - لاہور

یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ

(ایک نہایت خطرناک ٹیکنیک)

آپ کسی ایسی کتاب کا مطالعہ کریں جو مختلف قسم کی تنبیہات، ہدایات و تلقینات پر مشتمل ہو۔ اگر وہ سلیقہ سے لکھی گئی ہے تو اس کا ہر ورق آپ کے دل پر کچھ نہ کچھ اثر پیدا کرتا جائے گا۔ لیکن اس میں جو بات سب سے آخر میں کہی گئی ہو اور جس پر اس کتاب کا خاتمہ ہو جائے اسے بالخصوص اہمیت حاصل ہو گی۔ وہ قاری کے دل پر گہرا نقش چھوڑ جائے گی اور اس کا اثر بالعموم زیادہ دیرپا ہو گا۔

قرآنِ کریم ایک ضابطۂ ہدایت ہے جس میں زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق آسمانی راہنمائی دی گئی ہے۔ اس کا ہر حکم، ہر تاکید، ہر تلقین اپنی اپنی جگہ یکساں محکم اور اہم ہے اور ترتیب کے اعتبار سے ان کی محکمیت اور اہمیت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ (دس، دس روپے کے نوٹوں کی اگر ایک دستی رکھی ہو تو سب سے اوپر کے نوٹ اور سب سے نیچے کے نوٹ کی قیمت میں کچھ فرق نہیں آجاتا۔ یہی کیفیت، بلاتشبیہ، قرآنی اقدار و ہدایات اور اس کی آیات و سُوَر کی ترتیب کی ہے)۔ بایں ہمہ جس ہدایت پر اس کتابِ عظیم کا اختتام ہوتا ہے، قاری کے دل پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اس پر غور و فکر کے لئے اسے زیادہ وقت ملتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جو ہدایت اس کتابِ عظیم میں سب سے آخر میں دی گئی ہے اور جس پر اس کا اختتام ہوتا ہے وہ کس قدر غور و تدبر کی متقاضی ہے۔ اس کا اختتام ہوتا ہے سورۃ الناس پر جس میں کہا گیا ہے کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ مَلِكِ النَّاسِ ۔ اِلٰهِ النَّاسِ ۔ میں پناہ طلب کرتا ہوں، حفاظت میں آنا چاہتا ہوں اُس خدا کی جو تمام نوعِ انسان کا رب ہے۔ اس کا مالک ہے۔ اس کا الٰہ ہے۔ سب سے پہلے آپ اس نکتہ پر غور کیجئے کہ جس خطرہ سے حفاظت کے لئے خدا کی اتنی صفات کو یکجا کیا گیا ہے، وہ خطرہ کس قدر مہیب اور تباہ کن ہو گا۔ وہ خطرہ کیا ہے۔ کہا گیا۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔ وہ شر، وہ خطرہ ہے وسوسہ انگیزی۔ وسوسہ انگیزی ان لوگوں کی طرف سے جو چوروں کی طرح دبے پاؤں آئیں اور کسی کے کان میں کچھ پھونک کر، پھر دبے پاؤں واپس چلے جائیں۔ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴/۱-۶)۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کے دلوں میں وسوسے پیدا کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ ان سے

آپ اندازہ لگا لیجئے کہ وسوسہ انگیزی کتنا بڑا شر ہے جس سے حفاظت کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔ اتنا بڑا شر کہ اس سے حفاظت طلبی اور پناہ جوئی اس عظیم ضابطہ خداوندی کی آخری ہدایت ہے۔

وسوسہ انگیزی کی تباہ کاریاں اس زمانے سے نوع انسان کے ساتھ چلی آ رہی ہیں جب اس نے سب سے پہلے متمدنی زندگی شروع کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں کہا گیا ہے کہ ہبوطِ آدم کا سبب شیطان کی وسوسہ انگیزی تھی ۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ ۔ (۲۰/۱۲۰) یہ شر انسانی کاروان کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔ لیکن دورِ حاضر میں اس نے ایک خاص ٹیکنیک اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اس کی پیدا کردہ تباہ کاریوں کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس ٹیکنیک کو (WHISPERING COMPAIGN) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک شخص نہایت معتبر بن کر آپ کے پاس آتا ہے اور بڑے معصوم انداز سے کہتا ہے کہ "ارے بھائی! تم نے کچھ سنا؟ فلاں شخص کتنا معتبر بنا پھرتا تھا۔ اپنے مرحوم بھائی کی غریب بیوہ کا سب کچھ دبا کر بیٹھ گیا"۔ اس کے بعد وہ اس پر اضافہ کرتا ہے "لیکن ہمیں دوسروں کے معاملات سے کیا واسطہ۔ میں نے تم سے یہ بات یونہی برسبیل تذکرہ کر دی ہے۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اور ذکر آ بھی جائے تو میرا نام نہ لینا۔ ہم کیوں کسی کو بدنام کریں"۔ وہ نہایت رازدارانہ انداز میں آپ کے کان میں یہ سحر پھونک کر جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ وہ شخص جس کے خلاف یہ الزام تراشا گیا تھا، شام تک سارے شہر میں بدنام ہو جاتا ہے۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے اور تلاش کرتا ہے کہ وہ کون تھا جس نے یہ شوشہ چھوڑا۔ لیکن اس کا کچھ پتہ نشان نہیں ملتا۔ جس سے پوچھتا ہے وہ کہہ دیتا ہے کہ سارا شہر یہی کہتا ہے۔ آپ سوچیے کہ یہ بیچارہ کیسے مجرم ٹھہرائے اور کس کس کے سامنے اپنی برأت پیش کرے۔ یہ ہے ہمارے موجودہ معاشرہ کی عام روش ہے۔ اور اس سے وہ تباہی پھیلتی ہے جس کا مقابلہ ایٹم بم بھی نہیں کر سکتا۔ یہ درحقیقت دورِ حاضر کی ابلیسی سیاست کی پھیلائی ہوئی چنگاری ہے اور انتہائی منافقت اور بزدلی کی دلیل۔ یعنی اسے وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو دوسروں کے خلاف الزامات تو تراشتے ہیں لیکن انہیں کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ شر جس سے سامانِ حفاظت طلب کرنے کی تاکید قرآن مجید کی آخری سورۃ میں اس شد و مد سے کی گئی ہے۔

یہ شر انگیزی (شر کے معنی ہی چنگاری کے ہیں) یوں تو ہمارے معاشرے میں بھی عام ہے لیکن جماعت اسلامی نے اس میں بالخصوص مہارت حاصل کر رکھی ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ اس تحریک کے بانی (مودودی صاحب) کا فتویٰ یہ ہے کہ زندگی کی اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب اور اصول شکنی اور مخالفین کو دھوکہ سے قتل کر دینا (معاذ اللہ، معاذ اللہ) مسنون ہے۔ جب ان کے ہاں کے "اسلام" کی تعلیم یہ ہو تو پھر ان کے لئے وسوسہ انگیزی کی شرفشانیوں میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے۔ آپ پاکستان میں اس جماعت کی ستائیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی افواہیں پھیلانے کی مہم نے ایک دن بھی معاشرہ کو چین کی نیند نہیں سونے دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سے خود انہیں بھی مثبت طور پر کچھ حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اس ٹیکنیک کو اختیار ہی وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کی تذلیل و تخریب سے لذت حاصل کرنے کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوں۔ انہیں خود کچھ حاصل ہو یا نہ، وہ اس میں انتہائی کیف و سرور اور فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو ذلیل کر دیا اور فلاں اسکیم

کو ناکام بنا دیا۔ اس میں انہیں اپنی بڑی کامیابی نظر آتی ہے۔

پاکستان میں انہیں طلوعِ اسلام سے خاص طور پر خطرہ محسوس ہوتا تھا کیونکہ یہ اس جماعت کے تخریبی عزائم اور خود تراشیدہ اسلام کا پردہ چاک کرتا رہتا تھا۔ بنابریں، یہ ان کی شرر فشانی کی مہم کا خاص طور پہ ہدف چلا آرہا ہے۔ آپ اس ملک کے کسی ایسے دور دراز گوشہ میں چلے جائیں جہاں کسی ذریعہ ابلاغ کی رسائی ممکن نہ ہو۔ وہاں بھی اگر آپ کسی کے سامنے طلوعِ اسلام کا نام لے دیں تو وہ جھٹ سے کہہ دے گا کہ ہاں وہی جو تین نمازوں کا قائل ہے۔ اردو زبان میں نماز پڑھاتا ہے۔ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ایک نئے مذہب کا داعی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اس نے نہ کبھی طلوعِ اسلام کی شکل دیکھی ہوگی، نہ اس کے پڑھنے والوں میں سے کبھی کسی سے ملا ہوگا۔ آپ کو یہ اور اسی قسم کے دیگر بہتانات پاکستان کے ہر کونے اور کھدرے سے طلوعِ اسلام کے خلاف سنائی دیں گے۔ ایسا کہنے والے سے آپ اس کا ثبوت مانگیں گے تو وہ اتنا کہہ کر چل دیگا کہ ساری دنیا ایسا کہتی ہے۔

ان حضرات کی یہ تکنیک زبان و کلام تک محدود نہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں بھی یہی انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔ مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اشارات میں لکھا گیا:-

> مسلمان ہونے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ زبان سے اور دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت کا اعتراف کرے اور اس اعتراف کو اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تصور کرے کہ خدا تعالےٰ نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نبوت کا جو مقدس سلسلہ قائم کیا تھا اسے محمد الرسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اب قیامت تک حضورؐ ہی انسانوں کے مطاع اور ہادی اور رہنما ہیں۔

اس شرطِ ایمان کے بعد یہ کہا گیا۔

> حضورؐ پر ایمان کے سلسلہ میں بعض گمراہ طبقے بڑی عیاری کے ساتھ لوگوں کے اندر اس باطل خیال کو بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ بلاشبہ نبی برحق تھے اور ان کے عظیم الشان کارنامے بھی ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں لیکن حضورؐ کی نبوت اور حضورؐ کی تعلیمات کا تعلق چونکہ اس مخصوص دور سے تھا جس میں آپ مبعوث ہوئے۔ اس لئے ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یا زیادہ سے زیادہ ان کی وفات کے دس بارہ سال بعد وہ دور ختم ہو گیا، لہذا حضورؐ کے ارشادات اور فرمودات اور ان کے پاکیزہ افعال و اعمال خواہ اس دور کے لئے کس قدر غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہوں، مگر آج کے دور میں وہ تمام کے تمام واجب الاتباع قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ آج عصری تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی صحت اور افادیت کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ان عیار لوگوں کے الفاظ خواہ کتنے ہی دلفریب اور دلکش ہوں لیکن ان کے پیچھے صرف یہی جذبہ کام کرتا ہے کہ حضورؐ کی نبوت کو ایک

عارضی اور وقتی راہنمائی سمجھ کر اُسے ایک قصۂ پارینہ بنا دیا جائے۔

آپ نے دیکھا کہ اس میں نہ کسی فرد کا نام لیا گیا ہے، نہ کسی ادارہ، جماعت یا فرقہ کا۔ صرف "بعض گمراہ طبقے" کہا گیا ہے اور اس کے بعد بات وہ کہی گئی ہے جس سے اشتعال کی آگ دور دور تک پھیل سکتی ہے۔ یہ ہے وسوسہ انگیزی کی ایک مثال جو اس جماعت کا عام وطیرہ بن چکی ہے۔ ترجمان القرآن کے اشارات عبدالحمید صدیقی صاحب لکھتے ہیں۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں انہیں (نام لے کر) براہِ راست مخاطب کیا۔ اور خود مودودی صاحب کی تحریروں سے کئی ایک اقتباسات درج کئے جن سے واضح تھا کہ صدیقی صاحب نے اپنے شذرات میں جو اصول پیش کیا تھا وہ خود مودودی صاحب پر فٹ بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ان سے یہ سوال پوچھا تھا کہ وہ بتائیں کہ خود ان کے اپنے پیش کردہ اصول کی رو سے مودودی صاحب کے متعلق ان کا کیا فیصلہ ہے۔

ہمارے اس سوال کا جواب نہ (اس وقت تک ہمیں موصول ہوا ہے۔ (حالانکہ ہم نے وہیں لکھ دیا تھا کہ ان کے جواب کے لئے طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں) اور نہ ہی خود ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں اس کا کوئی ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کا جواب کیوں دینے لگے! ان کا مقصد تو جس میں چنگاری پھینکنا تھا وہ انہوں نے پھینک دی۔ طلوعِ اسلام ان کے حلقہ میں پڑھا ہی نہیں جاتا اس لئے انہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے کیا پوچھا تھا اور اس کی روشنی میں مودودی صاحب کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔

صدیقی صاحب یہ چنگاری پھینک کر الگ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد خود مودودی صاحب آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنی ایک مجلس میں حسبِ ذیل شوشہ چھوڑا فرمایا۔

> آجکل کے فتنوں میں ایک فتنہ تو انکارِ حدیث کا فتنہ ہے جو بڑے زور شور سے پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ اس کو جڑ پکڑنے کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن اس فتنہ کا مزاج ایسا ہے کہ جس آدمی کو مذہبی کھجلی ہو، لیکن وہ مذہب کی پیروی نہ کرنا چاہتا ہو تو اس کھجلی کو مٹانے کے لئے یہ بہت اچھا سامان دیتے ہیں کہ آدمی جیسا تھا ویسا ہی رہے۔ مغربیت میں غرق جس قسم کے فسق و فجور کے اعمال کرنا چاہے وہ سب کچھ کرتا رہے بس امام بخاریؒ کے خلاف کچھ کہے اور امام مسلم کے خلاف کچھ کہے۔ نہ نماز کی ضرورت نہ کسی اور چیز کی ضرورت منکرینِ حدیث کہتے ہیں، نماز کے تو وہ معنی ہی نہیں جو آپ نے سمجھ رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب تو نظامِ ربوبیت قائم کرنا ہے۔ یہ نماز قائم کرنا تھوڑی ہے آپ لوگوں نے نماز قائم کرنا لے لیا ہے۔
>
> اب یہ عجیب نظامِ ربوبیت کا قیام ہے کہ جس کے لئے وضو کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے مسجد میں جانے کی ضرورت ہے جس کے لئے ندا کی جاتی ہے کہ آؤ نظامِ ربوبیت قائم کرو۔ اس طرح کے جاہلانہ خیالات لوگوں میں یہ لوگ پھیلا رہے ہیں اور لوگ یہ سمجھ

۱؎ اس فقرہ میں غالباً (نہ) چھپنے سے رہ گیا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کچھ مطلب نہیں بنتا۔

سنتے ہیں کہ کہیں یہاں سے دین مل رہا ہے۔

(ایشیا ۔ لاہور ۔ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۴ء ۔ صفحہ ۱۲)

یہاں بھی آپ دیکھیے کہ کسی فرد یا ادارہ کا نام نہیں لیا گیا۔ وہی یوسوس فی صدور الناس کی ٹیکنیک اختیار کی گئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ "نظام ربوبیت" کی اصطلاح طلوع اسلام کی اختیار کردہ ہے۔ اس نے کوئی بیس سال اُدھر پرویز صاحب کی کتاب شائع کی جس کا نام ہی "نظام ربوبیت" تھا۔ اس کی ہر اشاعت کے ٹائیٹل کی پیشانی پر جلی الفاظ میں لکھا ہوتا ہے "قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر"۔ اس سے عیاں ہے کہ مودودی صاحب کی اس الزام تراشی کا ہدف کون ہے لیکن جرأت کا یہ عالم ہے کہ کھل کر نام نہیں لیتے۔ اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ بتائیے کہ طلوع اسلام نے یہ کہاں کہا ہے کہ نہ نماز کی ضرورت ہے، نہ وضو اور مسجد کی حاجت، تو اس کے جواب میں وہی خاموشی ہوگی جسے صدیقی صاحب نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہی صورت "منکر حدیث" کے لیبل کی ہے۔ طلوع اسلام میں متعدد بار اس کی حقیقت کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ در حقیقت منکر حدیث مودودی صاحب ہیں۔ جو صرف اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں جسے مزاج شناس رسول "(یعنی مودودی صاحب) صحیح قرار دیدیں۔ اس کے برعکس، طلوع اسلام کے نزدیک احادیث کے پرکھنے کا معیار قرآن کریم ہے جو حدیث قرآن کریم کے خلاف نہیں جاتی، طلوع اسلام اسے صحیح تسلیم کرتا ہے۔ یہ حضرات طلوع اسلام کے اس مسلک سے بخوبی واقف ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر وہ جھوٹ نہ بولیں تو وہ ترکِ واجب کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو "از روئے شریعت" سخت گناہ ہے۔ اور اعتراض کا جواب دینا ان کے نزدیک اس سے بھی زیادہ سنگین گناہ۔

اگر کوئی شخص انہیں براہِ راست مخاطب کر کے نجی طور پر جواب مانگے تو وہ کس قسم کا جواب پائے گا اس کے لئے بھی ہمارے پاس ایک مثال موجود ہے۔ کسی صاحب نے ان سے اسی قسم کا کوئی متعین سوال کیا۔ انہیں ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوا، انہوں نے اس کی اصل ہمیں بھیج دی۔ آپ بھی ذرا ملاحظہ فرمائیے اور ان حضرات کے اخلاق کی داد دیجئے۔ اس خط کی نقل حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت اسلامی پاکستان
۵۔ اے ۔ ذیلدار پارک ۔ اچھرہ ۔ لاہور

فون نمبر ۴۲۵۰۰۷
حوالہ ۳۱۵
تاریخ ۱۶/۲/۷۴

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۸ فروری ملا جو موجب تشکر ہے۔ مولانا محترم کی صحت اب اس کی متحمل نہیں ہے کہ وہ زیادہ دماغی محنت کر سکیں اور گھٹیا قسم کے معاندین سے بار بار الجھنا ان کا شیوہ بھی نہیں ہے۔ البتہ مجھ سے ہو سکا تو میں اپنے طور پر پرویز صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگرچہ میری صلاحیت و قوت بہت محدود ہے تاہم آپ دعا کریں۔ پرویز صاحب کی کتابیں بھی میرے پاس نہیں ہیں جن میں ایک

مزید کتاب مفہوم القرآن ہے۔ بہرکیف اگر خدا نے چاہا تو میں کوشش کروں گا۔

خاکسار

دستخط (غلام علی)

معاون خصوصی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ ہے ان حضرات کی ٹیکنیک جو "اقامت دین" کے نقاب میں عام کی جا رہی ہے اور یہ ہے اس تنظیم کے پیدا کردہ کردار کا ایک نمونہ۔ اب آپ سوچئے کہ قرآن کریم نے جس شر سے پناہ مانگنے کی تاکید اپنی آخری ہدایت میں کی تھی وہ کس قسم کے نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ خدا اسلام اور اس ملک کو ان لوگوں کی شر انگیزیوں سے محفوظ رکھے۔

—— (۰) ——

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے

بمقام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

ٹیلیفون۔ (۸۰۸۰۰)

لائل پور میں

بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)

۵½ بجے سہ پہر۔ بمقام۔ دفتر بزم طلوع اسلام

۴۵۔ کوتوالی روڈ۔ متصل حیات سرجری کلینک

رابطہ کے لئے۔ فون [illegible]

ملتان میں

بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)

۱ بجے بعد نماز جمعہ

بمقام دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ

ملتان

فون۔ (۲۰۷۱)

سیالکوٹ میں

ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)

چوہدری محمد دین ولد کمال دین۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام

مکان ۸۹ موضع و ڈاکخانہ گوہد پور۔ (علاقہ [illegible] سیالکوٹ)

کراچی میں

ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ دفتر بزم طلوع اسلام۔ دارالقائد

۳۰۳/بی [illegible]۔ ناظم آباد ۳۔ کراچی ۱۸

فون نمبر ۶۱۰۴۶۸

راولپنڈی

ہر جمعہ ۵ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- جی ۱۶۶

لیاقت روڈ۔ راولپنڈی

کوئٹہ میں

ہر اتوار ۳ بجے بعد دوپہر۔ (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- ۲۸ گوردت سنگھ روڈ

فون (۷۷۰۰) کوئٹہ

واہ میں (بذریعہ ٹیپ)

بعد نماز جمعہ

بمقام۔ ۱۵۔ جہلم روڈ۔

WAH ۔ واہ

حقائق و عبر

۱- وحی کی آواز؟

کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ البلاغ۔ اس کے مدیر محترم مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس ماہنامہ کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء میں حکیم محمود احمد ظفر صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ۔ وحی کی آواز ۔ اس میں وہ مختلف روایات کی سند سے، یہ بتاتے ہیں کہ جب نبی اکرم ؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں ۔ کبھی گھنٹے کی سی آواز۔ کبھی مکھیوں کے گنگنانے کی سی۔ ان آوازوں کو اہل مجلس بھی سنتے تھے۔ یہ آواز کس کی ہوتی تھی، اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

(۱) پہلا مسلک جو کہ سب سے نمایاں ہے، امام بخاریؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی آواز ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں جس میں صاف الفاظ ہیں۔

اذا تکلم اللہ بالوحی　　　جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے

علاوہ ازیں آپ نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں کئی احادیث ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ایسا ہی ابن عربیؒ نے بھی لکھا ہے۔

(۲) دوسرا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پروں کی ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ کئی علماء کا یہی مسلک ہے۔ (فتح الباری، جلد ۱ صفحہ ۱۹)۔

(۳) تیسرا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ فرشتہ کی زبان کی آواز ہوتی تھی۔ کئی شارحین بخاری اور جلیل القدر محدثین اس کے بھی قائل ہیں۔　　فاللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اس کے بعد وہ اس کی، فلسفیانہ تشریح، کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آواز کے اس تیز احساس اور خفیف احساس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وحی خواب خیال سے بالاتر ایک محسوس شے ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ اس کی بے کیف آواز سے بھی مجلس میں بیٹھنے والے ادراک کر لیتے ہیں۔ اور جو جاہل وحی کو والعیاذ باللہ، محض ایک دماغی تخیل سمجھتے ہیں۔ وہ نبوت کی حقیقت سے جاہل اور ناآشنا ہیں۔

> کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کی اس صورت میں جو آواز سنائی دیتی تھی وہ تو گھنٹے کی آواز کی طرح بقول سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ کے مشابہ ہوتی تھی۔ اس سے آپ کو احکامِ الٰہی کا پتہ کیسے چلتا؟ اس سوال کا جواب شاید زمانۂ ماقبل میں مشکل ہوتا لیکن عصرِ جدید میں ٹیلیگراف کی ایجاد نے اس سوال کے جواب کو آسان ترین بنا دیا ہے۔ تارگھر میں جا کر دیکھیے آپ کو وہاں صرف ٹک ٹک کی آواز سنائی دے گی جس کو آپ فضول اور لایعنی سمجھیں گے لیکن تار کلرک جو اس فن سے واقف ہے، اسی آواز کو سن کر تار لکھتا جاتا ہے۔ آواز ایک ہی ہے، لیکن ایک کے نزدیک بامعنی اور دوسرے کے نزدیک بے معنی۔ اسی طرح بلا تشبیہ اگر وحی کی آواز کوئی دوسرا سن بھی لے تو وہ اس کی کیفیت کو اپنے علم کے لحاظ سے اپنے الفاظ میں بیان تو کر سکتا ہے، لیکن اس بسیط اور بے جہت آواز کلامِ الٰہی کو اخذ نہیں کر سکتا۔ یہ کلام صرف اور صرف ایک نبی اور رسول ہی سمجھ سکتا ہے جس پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں۔
>
> وصلصلة الجرس ههنا كنقرات التلغراف لاداء الرسالة
>
> (مشکلات القرآن ص۲۴۲)
>
> اور گھنٹی کی آواز ٹیلیگراف کی ٹک ٹک کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لئے کی جاتی ہے۔

"وحی کی آواز" اور اس کی اس تشریح کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر رہ جائے، اور کیا کرے۔ مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے نہ قرآن ہوتا ہے، نہ ہی عصرِ حاضر کے علوم، اور نہ ہی یہ کبھی اس پر غور کرتے ہیں کہ معاندینِ اسلام نے کس مقصد کے لئے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں جنہیں اب بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔

وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کوئی غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا۔ نہ ہی اسے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کے نزول کی کیفیت کیا تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی ہے کہ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ۔ (۹۷/۲) جبریل اسے بحکمِ خداوندی قلبِ نبوی پر نازل کرتا تھا۔ دوسری جگہ ہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (۱۹۳/۲۶) روح الامین اسے لے کر قلبِ محمدی پر نازل ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو علم کسی کے قلب میں اتارا جائے، اس کی آواز کیسی، اور کسی دوسرے کو اس کا علم و احساس ہونے کا سوال کیا؟ یہ تو رہی ان حضرات کی قرآن کریم سے بے خبری! باقی رہا علم، سو یہ کہتے ہیں کہ

وحی خواب و خیال سے بالاتر ایک محسوس شے ہے۔

انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جب "خواب و خیال" بھی محسوس شے نہیں ہوتے تو ان سے بالاتر وحی، محسوس شے کیسے ہو سکتی ہے: وحی کو خدا نے عالمِ امر سے متعلق بتایا ہے۔ جب کہا ہے وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا۔ (۵۲/۴۲)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عالمِ امر، عالمِ خلق (یعنی عالمِ محسوسات) سے بالکل الگ اور غیر مرئی اور غیر محسوس ہے۔ لہٰذا "وحی محسوس شے کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے محسوس شے قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہماری مادی

دنیا سے متعلق ہے۔ اس سے وحی کا منفرد تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسے
(۱) خدا کی ایسی آواز قرار دینا جسے اہلِ مجلس بھی سن لیتے تھے، خود خدا کے متعلق جو تصور سامنے لاتا ہے وہ ظاہر ہے۔
(۲) اسے فرشتہ وحی کے پروں کی آواز یا اس کی زبان کی آواز کہنا خود ملائکہ (روح الامین) کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔

اور اسے "ٹیلیگراف کی ٹک ٹک" سے تشبیہ دے کر، وحی کو جس مقام پر لے آیا گیا ہے اس کے تو خیال تک سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ جب وحی کے متعلق آپ کی یہ تفصیلات اور تشبیہات، غیر مسلم اہلِ علم و دانش کے سامنے جاتی ہیں تو وہ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کیا خیال قائم کرتے ہیں اور جب اس قسم کی باتیں خود ہمارے اپنے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آتی ہیں تو وہ کس طرح اسلام سے برگشتہ ہی نہیں متنفر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض! ان کا اسلام تو بس اتنا ہی ہے کہ ان روایات کو تنقید کی حد سے بلند سمجھا جائے۔ اور جو بدبخت ان پر دعوتِ غور و فکر دے اسے منکرِ حدیث قرار دے کر، اس پر کفر کا فتویٰ عاید کر دیا جائے۔ اور اسے دین کی سب سے بڑی خدمت قرار دے کر، قوم کے سر پر احسان دھرا جائے۔

۲۔ یہ کونسے قرآن میں ہے؟

ہفت روزہ ایشیا کی اشاعت بابت ۱۹ جنوری ۱۹۷۵ء میں مودودی صاحب کی شام کی ایک مجلس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ایک صاحب کا سوال تھا کہ شادی شدہ زانی یا زانیہ کو رجم کرنے کا حکم قرآنی ہے یا تورات سے ماخوذ ہے؟
>
> مولانا محترم نے بتایا کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی کتابوں میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ تاہم مختصر جواب یہ ہے کہ کوڑوں کی سزا سے پہلے زانی کو رجم کیا جاتا تھا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لئے الگ الگ سزائیں مقرر کر دیں۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزائیں قرآن کریم میں درج ہیں اور قرآن کریم میں زنا کی سزا کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲۴/۲)
>
> زانی عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی کوئی تفریق نہیں۔ نہ ہی ان کے لئے قرآن میں کہیں الگ الگ سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ یہ حکم (کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی الگ الگ سزائیں ہیں)، کون سے قرآن میں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو ہر قسم کی ذمہ داری سے بلند سمجھنے لگ جائے تو اس کے جی میں جو آئے وہ کہتا دیتا ہے۔ ایسا کہتے وقت وہ اتنا بھی نہیں سوچتا کہ اس کی زد کہاں جاکر پڑتی ہے۔ اس کی زد سے خدا کی کتاب تک بھی محفوظ نہیں رہتی۔ وہ اس میں بھی تصرف کرنے سے نہیں جھجکتا۔

لیکن نہیں، مودودی صاحب سے بھی زیادہ افسوس ان کے معتقدین پر آتا ہے۔ وہ ان کی مجلس میں خلافِ قرآن ایک بات کہتے ہیں اور انہیں کوئی نہیں ٹوکتا۔ پھر اس قسم کی باتیں ان کے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ اور ان کی جماعت کا کوئی شخص بھی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ مقام کیا ہے جسے مودودی صاحب نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے اور یہ کس قسم کی جماعت ہے جو انہوں نے "اقامتِ دین" کے لئے تیار کی ہے۔

———(۰)———

۳۔ اشتراکیت اور اسلام

اخبار ایشیا بابت ۲ر فروری ۱۹۷۵ء میں مودودی صاحب کا حسب ذیل قول نقل کیا گیا ہے۔

سوشلزم وہ پھندا ہے جو اپنی خوشی سے گلے میں ڈالا تو جا سکتا ہے لیکن اپنی خوشی سے اتارا نہیں جا سکتا۔

کیا مودودی صاحب، یا ان کی جماعت سے متعلق کوئی صاحب، یہ بتائیں گے کہ اگر کوئی سوشلسٹ یہ کہے کہ یہی پوزیشن تمہارے اسلام کی ہے۔ اسے بھی اپنی مرضی سے قبول تو کیا جا سکتا ہے لیکن (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) چھوڑا اپنی مرضی سے نہیں جا سکتا۔ چھوڑنے والے کی سزا موت ہے۔ تو اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟

———(۰)———

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ ضخامت پانصد صفحات کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش۔ قیمت تیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

پتہ: مکتبہ دین و دانش ـ چوک اردو بازار۔ لاہور؛ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

مساواتِ اسلامیہ

[مکتبۂ امامیہ مشن پاکستان لاہور کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "شہیدِ انسانیت" اس کے مصنف ہیں "مفکرِ اسلام مجتہد العصر نابغۂ روزگار سید العلماء الحاج سید علی نقی النقوی" اس کے ایک باب میں انہوں نے بتایا ہے کہ اسلام نے مساواتِ انسانیہ کی جو تعلیم دی اس کی رو سے فضیلت کا معیار حسب نسب، نسل، خون، رنگ، قوم، وطن نہیں بلکہ صرف تقویٰ ہے۔ ذیل میں ہم اس کے متعلقہ اقتباسات بمسرت شائع کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام]

(۰)

(زمانۂ ظہورِ اسلام سے قبل کے عربوں کی حالت بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے)

وہ ایسے وقت میں محمدؐ بن عبداللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغامِ انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آ گئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے "حضرتؐ کا کام یقیناً دشوار تھا۔ اس لئے کہ آپ محض وحشی لوگوں کو متمدن نہیں بنا رہے تھے بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سدھارنا چاہتے تھے۔ آپ کا کام ان تمام عقاید و توہمات، روایات و مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ رسولؐ ان لوگوں کو بردباری، خاکساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے، جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسولؐ ان لوگوں کو مساوات اور اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے قمار بازی بند کر دی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل وجود کی ایک قطعی علامت تھی۔ اور بہت سی مخربِ اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکہ خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے۔ یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔"

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسے بہت اچھے لفظوں میں لکھا ہے کہ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لئے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولت مندوں کے زیرِ حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغامِ آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے دعوے دار تھے۔ آزادی گردہ امراء کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پرواہ کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی۔ بلکہ بغیر روک ٹوک کے

حریفانہ طریقوں پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لئے ان کے مالکوں کے مظالم اور خلافِ انسانیت بے رحمانہ سلوک سے۔ آزادی طبقۂ نسواں کے لئے اس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کر دی گئی تھیں۔ آزادی عام انسانوں کے لئے ان قیود سے جن میں وہ ذات پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے ان کی حیاتِ اجتماعی دفن ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے۔ مگر وہ انسانی اس طرح اپنی خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔" (صفحہ ۵۰)

اسلام نے اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے سوا مساوات قائم کرنے کے لئے دولت کو برابر تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن بازوؤں کی طاقت، مروّتی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں اس لئے اس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اس نے صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہے؟ احساسِ اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اس کے اجزا میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ اس لئے کہ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل سے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگی اور مغرب والے آپس میں یک جہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور منسوب ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا۔ یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں اتحاد پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا، تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آ رہے ہیں۔ اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا۔ یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے۔ اور ایشیا والے ایک الگ قوم۔ اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا، بلکہ ایک عبادت گاہ میں عبادت کے لئے ایک ہی مذہب والوں کے لئے جمع ہونا تک ممنوع قرار دیا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ

اتحاد کی دیواریں عالمِ انسانیت کے بیچ میں اٹھائی گئی تھیں۔ اس لئے ہر دیوار جو اٹھی اس نے اِدھر والوں کو تو متحد کیا اور اُدھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحادِ افراد کا راز اتحادِ مرکز ی میں مضمر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کے بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالمِ انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطے کے باہر کچھ رہ نہیں جائے گا اس لئے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔ اس کے لئے کوئی مادی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہو گی وہ محدود ہو گی اور محدود ہونے کے ساتھ اس میں قرب و بُعد نیز کمی اور زیادتی کے مدارج پیدا ہوں گے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادی بلند و بالاتر طاقت کی طرف موڑ دیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہے جسے اسلام نے معبودِ برحق اور خدائے کل ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلۂ مقصود قرار دے دیا ہے۔

اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں، افرادِ انسانی میں احساسِ اخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادرِ وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یکجہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن جائیں۔ یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغائرت برتی تھی۔ انہوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا۔ اور یہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کو ذکر کرتے ہوئے ایک طنزیہ انداز میں اس سے مخالفت کی، اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس، بلکہ مسلمانوں کو اقوامِ عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ھو ربنا و ربکم لنا اعمالنا و لکم اعمالکم۔ (یعنی) وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیارِ امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نیا معیار امتیاز کا قائم ہو گیا اور وہ یہ کہ جو شخص فرائضِ انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر فقط احساسِ فرائض کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔"

(صـ۵۵-۵۷)

دو اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن

۱۔ شعلۂ مستور

حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش، کوائفِ حیات اور دنیا سے تشریف بری کی اصل حقیقت ایک معمہ بنی چلی آ رہی ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے ہر قلبِ تجسس بیتاب ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی قرآنی بصیرت اور وسیع مطالعہ کے بعد، اپنی کتاب شعلۂ مستور میں ان موضوعات پر سیر حاصل بحث کی تھی، لیکن وہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی۔ اب انہوں نے، مزید تحقیقات کی روشنی میں اس پر نظرِ ثانی کی ہے، اور اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے کتاب عمدہ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مضبوط جلد اور دیدہ زیب گرد پوش سے مزین ہے۔ اشیائے مطلوبہ کی ہوشربا گرانی کی وجہ سے اس پر بڑی لاگت آئی ہے لیکن ہم نے اس میں خساست سے کام نہیں لیا۔

قیمت فی جلد — پچیس ۲۵/- روپے مقرر کی گئی ہے۔ اور محصولڈاک — دو ۲/- روپے۔

جن احباب کی فرمائشیں موصول ہو چکی ہیں انہیں کتاب پہلے بھیجی جا رہی ہے۔ آپ بھی جلدی فرمائش بھیج دیں۔

―――― (۰) ――――

۲۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت"

یہ وہ کتاب ہے جس کا ملک بھر میں عام چرچا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو اکتوبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس دوران میں قارئین کی طرف سے مزید اضافہ کی تجاویز موصول ہوئیں چنانچہ اب اس کا نیا ایڈیشن ان اضافوں کے ساتھ، شائع ہو گیا ہے۔ اسے بھی عمدہ سفید کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ اور طباعت بھی (پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں) صاف اور ستھری ہے۔ نیز اسے اب مجلد شائع کیا گیا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر اس کی قیمت میں تھوڑا سا اضافہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ اب اس کی قیمت پندرہ ۱۵/- روپے فی جلد ہے اور محصولڈاک ایک روپیہ پچاس پیسے فرمائشیں اس کے لئے بھی بہت سی موصول ہو چکی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ آپ بھی اپنی فرمائش جلد بھیج دیں تاکہ اگلے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ ختمِ نبوت کی اہمیت اور حقیقت کے سمجھنے اور تحریکِ "احمدیت" کے محرکات، اسباب و مقاصد کو بے نقاب دیکھنے کے لئے، اس انداز کی کوئی اور کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ اس نے اس تحریک کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔

―――― (۰) ――――

ان دونوں کتابوں، اور پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کے ملنے کا پتہ۔

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

کاٹیج انڈسٹریز

حکومتِ پاکستان کے منظور شدہ

برآمد کنندگان

پوسٹ بکس ۴۰۲۔ راولپنڈی

کروشیا وغیرہ کا کام کرنیوالی خواتین کیلئے بہترین موقع

مندرجہ ذیل مراکز سے رجوع فرمائیے

۱۔ مزمّل انڈسٹریل ہوم ۔ گلی ۳ ۔ محلہ فیروز پورہ ۔ راولپنڈی

۲۔ منوّر ویلا ۔ لیّہ ۔ (ضلع مظفر گڑھ) ۔ ضلع مظفر گڑھ میں برآمد EXPOR کا واحد ادارہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۷۴ء

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے!

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

صاحبِ صدر و برادرانِ عزیز!

جسے ہمارے اپنے اخبار باقی ماندہ پاکستان کہتے ہیں اور اربابِ سیاست نیا پاکستان - باقی ماندہ سے (اصلی رہنے والے) پاکستان کے ساتھ ایک رشتہ ایک تعلق تو محسوس ہوتا ہے، "نئے پاکستان" میں یہ بھی نہیں۔ اس کا تو ایک پس منظر تھا، اس کی ایک جدوجہد کی تاریخ تھی، یہ نیا پاکستان کیا ہوگا، کن خطوط پر استوار ہوگا، اس کے پیچھے کیا فلسفہ ہوگا - کون کہہ سکتا ہے —— ابھی تو یہ لوگ خود بھی اس کے متعلق واضح نظریہ نہیں رکھتے۔

حاشیہ آرائی اور تمہید کا وقت گزر چکا ہے، اس لئے صاف سیدھی بات کروں گا۔

ابھی کل تک ہم بارہ تیرہ کروڑ کی مضبوط قوم تھے، دنیا کی عظیم ترین اسلامی مملکت تھے اور آج ہم دو نیم ہو گئے ہیں، ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور، دو حصوں میں بٹ چکے ہیں - ایک حصے میں وہی ابلیسی، سیکولر نظام ہے جس سے چھٹکارا پانے کو ہم نے ساری جدوجہد کی تھی اور دوسرا حصہ وہ ہے جسے ہمارے اپنے اخبار اور سیاست دان باقیماندہ پاکستان کہتے ہیں۔

اس باقیماندہ سے اوائل قیامِ پاکستان کا ایک واقعہ یاد آگیا کہ بھارت ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں - یہ آل انڈیا ریڈیو ہے، اناؤنسر نے کہا - آل انڈیا ریڈیو کا نام سن کر ایک پاکستانی بھڑک اٹھا: آل انڈیا کیسا، دلیسٹ آف انڈیا - باقیماندہ انڈیا کہو۔

مقامِ عبرت ہے کہ آج انڈیا بشمول بنگلہ دیش مکمل تر ہے اور پاکستان باقیماندہ پاکستان ہو کر رہ گیا ہے۔

رن کچھ کی لڑائی کے فوری بعد ہی کافی ہاؤسوں میں دانشوروں کی بحث شروع ہو گئی تھی، ہمارے پڑھے لکھوں نے عقلمندیاں بگھارنی شروع کر دی تھیں۔ انڈیا بہت بڑا ملک ہے اس کے (RESOURCES) بہت زیادہ ہیں - پاکستان اس کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے، اب زمانہ بدل گیا ہے - اب جنگیں (RESOURCES) ریسورسز اور سازوسامان کے بل پر لڑی جاتی ہیں، جذبے کے بل پر لڑنے کا زمانہ اب کہاں —— مگر دنیا نے ۱۹۶۵ء کی سترہ دنوں کی شدید اور مسلسل جنگ میں دیکھا کہ صرف ہتھیار جنگ کا فیصلہ نہیں کرتے، جو ہاتھ ہتھیار چلاتا ہے آج بھی اہم ہے - جذبہ ہتھیاروں میں جان ڈال دیتا ہے۔

جنگ ختم ہوئی تو ہم سمجھ بیٹھے کہ مسئلے حل ہو گئے ہیں - حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ جنگ نامکمل رہی تھی اور جہاں ہندوستان جیسا ملک ہمسایہ ہو، وہاں تو اپنے تحفظ سے بے پرواہ ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہاں تو ایک مستقل کانفرنٹیشن کی صورت حال ہے - کہاں کی جنگ اور کیسا امن!

جنگ اور امن میں کچھ فرق نہیں ہے ایسا
کشمکش رہتی ہے میدان بدل جاتا ہے

ہم حریف کی طرف دیکھنے اور اس کی اگلی چال کو سمجھنے کی بجائے آپس کی سر پھٹول میں مصروف ہو گئے - جنگ کے دوران چار دن

کے لئے اتحاد و اتفاق، محبت و یگانگت، قربانی اور بے لوث خدمت کا جو جذبہ ابھرا تھا۔ اسے ہم نے پروان چڑھانے کی بجائے تھپک تھپک کر سُلا دیا۔

آپ چھ ستمبر کو کبھی گنج شہیداں گئے ہیں؟ وہاں اپنے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ انہی میں چند ایک ان بنگالی سپاہیوں کی بھی ہیں جو ۱۹۶۵ء کے معرکے میں مغربی پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے کام آئے، اس بار سب سے زیادہ دکھ مجھے انہی قبروں کو دیکھ کر ہوا۔

ہمارے سپاہیوں کی قبریں وطن سے دور اور ملکوں میں بھی ہوں گی۔ افریقہ کے صحراؤں، یورپ کے میدانوں یا برما کے جنگلوں میں جہاں انہوں نے انگریزوں کے تنخواہ دار سپاہیوں کی حیثیت میں جنگوں میں دادِ شجاعت دی ــ مگر یہ بنگالی تو ان سے مختلف تھے۔ یہ تو گھروں سے دُور ہونے کے باوجود اپنے ہی وطن کی سرحدوں پہ اپنے ہی بہن بھائیوں کی حفاظت کرتے ہوئے کام آئے تھے۔ اور آج وہ اپنے ہی وطن میں غریب الدیار ہیں۔ فانی نے شاید انہی کے لئے کہا تھا ؎

غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

مقدور ہو تو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ۱۹۶۶ء کے شروع میں چھ نکات کے خالق ـ یا شاید سے پالک ـ مجیب سے پوچھوں کہ ان کی قربانیوں کو کیا نام دیا جائے؟ اس کے مغربی پاکستانی حواری آج بھی اسے محبِّ وطن ثابت کرنے کی جسارت کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے علیحدگی پہ مجبور کیا گیا، حالانکہ اس کا یہ بیان ابھی فضا میں زہر گھول رہا ہے کہ اس کا پچیس سالہ خواب پورا ہوا ہے۔ میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں وہ ۲۵ سال کب سے گننا شروع کروں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ سے ہم نے کیا پایا، ایک احساس بیدار ہو گیا تھا پاکستانی ہونے پہ فخر کا: سر اونچا کر کے چلنے کا ایک انداز ملا تھا مگر بہت جلد وہ انتشار کی نظر ہو گیا ـــــ اور ادھر بھارت نے اس کے لئے کمیشن بٹھائے اپنی کمزوریوں کو جانچا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے حریف یعنی پاکستان کی کمزوریوں کو ڈھونڈا۔ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان پر اپنے ڈیفنس کے لئے انحصار، بحری قوت کا فقدان، مشرقی پاکستانیوں میں احساسِ غربت، بنگالیوں کی قومی عصبیت۔ ان سب نے اسے سمجھایا کہ اس سارے سلسلے میں مشرقی پاکستان ایک کمزور کڑی ہے اور اس نے اپنی تمام تر توجہات اس پہ مرتکز کر دیں۔ یہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ براہِ راست حملے سے یہ قوم دبنے والی نہیں۔ اسے اندر سے کھوکھلا کر دو۔ اندر سے کھوکھلا درخت باہر سے کیسا ہی مضبوط کیوں نہ نظر آئے، ایک وار بھی نہیں سہہ سکتا۔ اس نے اس کے لئے (PLAN) کیا۔ ہماری کمزوریوں کو ڈھونڈ کر اس سے فائدہ اٹھایا۔ بنگالیوں کو غربت کا احساس پہلے ہی سے تھا، اس غربت کا ذمہ دار مغربی پاکستان والوں کا استحصال بتایا گیا۔ غلط سلط اعداد و شمار کے چکر میں پڑھے لکھوں کو بھی گمراہ کر دیا۔ مسلسل پراپیگنڈے سے مغربی پاکستانیوں کو غیر ملکی اور استحصال کرنے والے ثابت کر کے ان کے خلاف اکسایا، اور پھر ان میں ایسے لوگ ڈھونڈ لئے، جو ان کے آلہ کار بن سکتے تھے ـــــ اقتدار کا خواب انسان کی عقل پر پردہ ڈال کر اسے ہمیشہ سے میر جعفر بناتا رہا ہے، لوگ تاریخ کے اسباق اکثر بھول جاتے ہیں، مگر تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہر میر جعفر کا انجام وہی ہوتا ہے جو اس سے پہلے میر جعفر کا ہوا تھا۔

اُدھر ہمارا دشمن یہ کچھ کر رہا تھا اور ہم کبھی بنیادی جمہوریتوں کے دس سالہ دورِ ترقی کے جشن منا رہے تھے، اور کبھی مغربی پارلیمانی جمہوریت کی شیلم پری کی تلاش میں چل نکلے، اور جنگلوں، بیابانوں کی بجائے کلبوں، بازاروں میں ناچ ناچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ہم نے بنے بنائے کئی گھروندے ڈھا دئے تاکہ ان میں نئی مُورتیاں سجا سکیں، غیر اسلامی جو

نظام بھی ہوگا، اسلئے ہم مورتیاں سچا نا ہی کہیں گے۔

جمہوریت، اسلامیانِ پاکستان کی آنکھوں کا نور بنی تو اس کے ساتھ ہی اس کی توام بہن سیکولرزم چپکے سے در آئی اور خاموشی سے پَر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ رنگ، نسل اور زبان کے جو بُت ہم نے توڑ کر اس بتکدۂ ہند میں خدا کا گھر بنانے کا عزم کیا تھا، اس کو ایک دھچکا سا لگا۔ ساری جدوجہد پر اپنوں کی نا سمجھی اور غیروں کی عیاری نے ایک ہی ہلّے میں پانی پھیر دیا اور نئی دہلی کے لال قلعے میں جس پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کا عزم ادھر بار بار سننے میں آتا تھا، وہاں رنگ کی ساڑی لہراتی اور رانی اندرا نے بڑے فخر سے سر اونچا کر کے کہا "ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعوےٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے سیکولرزم نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل۔ چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔"

اندرا کی اس آواز کے بعد ہز ماسٹرز وائس نشان کے پیچھے بیٹھے ہوئے "جمورے" نے بھی وہی راگ الاپا۔ تاج الدین، نذرالاسلام، اندرا کی اس جنبشِ ابرو کے سامنے سر جھکائے کھڑے نظر آئے۔

اور اس باقیماندہ پاکستان میں بھی کچھ سپید ریش، دلی بڑی دور کی کوڑی لائے۔ ان کی بھی بالآخر ۲۵ سال بعد آنکھوں کی خوابی دور ہوئی اور انہیں بھی روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دو قومی نظریے کے ختم ہونے کی خبر ملی۔ قومیتوں کا پرچار ہونے لگا۔ پاکستان میں چار قومیتوں کا وجود ڈھونڈ نکالا گیا ——— بنگلہ قومیت کے بعد یہ اس کی قدرتی (COROLLARY) تھی۔ یہ نعرے جان بوجھ کر ڈھونڈے گئے۔ یہ دراصل مسلمان قومیت کی نفی کی در پردہ کوشش تھی۔

——— اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ جبّہ و دستار، منبر و محراب کے نام لیوا، متشرع قسم کے بزرگوار بھی ہیں جو اپنے وعظ و نصیحت میں تو اسلام کی آفاقیت پر زور دیتے ہیں مگر قومیت کے معیار کے معاملے میں انتظامی سہولتوں کے لئے زمین پر کھینچی گئی لکیروں کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہی پرانے کانگریسی ہیں جو اسی منطق کے قائل ہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ جن کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

وہ آج بھی اسی مقام پر ہیں۔ ان کا نظریہ آج بھی وہی ہے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ظرف تو کسی کے حصے میں نہیں آیا کہ علی الاعلان کہہ دیتے کہ ہم غلطی پر تھے اور پھر سیاست سے کنارہ کش ہو جاتے۔ ان لوگوں کے سیاسی گورو گاندھی جی نے کہا تھا "ہند میں بسنے والے مسلمانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جن کے باپ دادا ہندو تھے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض مذہب بدلنے سے مسلمان الگ قوم کیسے ہو گئے۔"

یہ بات گاندھی جی کی تو شاید سمجھ میں نہ آ سکتی تھی۔ اگرچہ ایسے بے سمجھ وہ بھی نہ تھے۔ تجاہلِ عارفانہ اور بات ہے ———

مگر مفتی صاحب اور حضرت لاہوری (مرحوم) کے قابلِ تعظیم فرزند سے تو اتنا پوچھا جا سکتا ہے کہ حضور آپ تو جانتے ہوں گے کہ ابولہب اور محمدؐ کا رشتہ آپس میں کیا تھا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کی زبان ایک تھی، ان کا لباس ایک تھا۔ ان کا رہن سہن ایک سا تھا، ان کا بقول آپ کے دانشوروں کے، کلچر ایک تھا۔ مگر وہ ایک قوم کے افراد اس دن نہ رہے، جب محمدؐ نے اپنے دین کا اعلان کیا۔ اور پھر حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ اور فارس کا سلمانؓ میرے اور آپ کے آقاؐ کے قریب تر ہو گئے ان کے لئے عزیز تر بن گئے، ان کی جماعت، ان کی امت کے افراد قرار پائے، ان کی قوم بن گئے۔

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

ماضی میں لوٹنے کا فائدہ تو نہیں لیکن قیام پاکستان کے وقت اگر ہم اس خطۂ زمین کو دنیا کے تمام ایسے مسلمانوں کے لئے (OPEN) قرار دیتے، جو اس نظریے پر یقین رکھتے ہوں کہ قومیں دین نظامِ زندگی، مشترک ایمان کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، تو ایک طرف تو عالمِ اسلام کے بہترین صلاحیتوں کے افراد یہاں جمع ہو جاتے، اور دوسرے قومیتوں کے یہ تنگ نظریے ہمارے لئے خلش کا باعث نہ بنتے اور اقبال کی یہ تلقین "تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا" عملی صورت میں سامنے آ جاتی اور اس بیکراں سمندر میں سارے ولی، سارے مفتی بہہ گئے ہوتے۔

۱۹۷۱ء کا سانحہ عالمِ اسلام کا افسوسناک ترین سانحہ ہے۔ سقوطِ بغداد کے بعد سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ ہلاکو کبھی بغداد کا رخ نہ کرتا، اگر خلیفۂ بغداد کا مسلمان وزیر اعظم ہلاکو کو اس کے مسلمان مشیر کے ذریعے تعاون کا یقین نہ دلا دیتا اور اندرا بھی یہ حوصلہ نہ کر پاتی اگر وہ پہلے سے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے زمین ہموار کر چکی ہوتی۔ اب تو یہ کہنا بھی سیاسی پالیسی کے خلاف ہوگا مگر جو ہم پہ گزر چکی ہے اس کے جائزے کے لئے ہمیں یہاں تک جانا ہی پڑتا ہے، سنا ہے، ڈی پی دھر کی سربراہی میں ایک کمیٹی مسلمانوں کی تاریخ کو کھنگال رہی کہ وہ طریقہ ڈھونڈ نکالیں جس سے غداری (SUB VERSION) راہ پا جائے۔

انہوں نے تو یہ کچھ کیا اور اب بھی کر رہے ہیں، کیونکہ اندرا کہہ چکی ہے "ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی یہی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریے کو ترک کر کے اشتراکِ وطن کی بنا پہ ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں، ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی مغربی پاکستان کا بھی ہوگا" فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہتھیار بدل دئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تلواروں پہ نیا میں بڑی منقش، خوشنما گل بوٹوں سے مزین ڈال دی ہیں تا کہ ان کے شکار کی نگاہ ان کی دلفریبی تک رہے اور وہ اپنا کام کر جائیں۔

آپ اس بات پہ غور کریں۔ بھارت نے اپنا ٹی وی، الہ آباد میں نہیں لگایا، لکھنؤ میں نہیں لگایا، آگرہ میں نہیں لگایا، مدراس میں نہیں لگایا، اپنے پیارے چہیتے بنگلہ دیش کے بارڈر پہ اگر تلہ میں نہیں لگایا۔ امرتسر میں لگایا ہے تا کہ اپنے پہلو میں مسلسل چبھنے والے اس تیکھے اور چبھتے ہوئے خار ——— لاہور ——— کی غیرت کی نوک رگڑ کر بے کار کر دے۔ وہ لاہوری جو چھ ستمبر کو ہندوستان کی توپوں کی گھن گرج سن کر شاہدرہ کی طرف نہیں بلکہ واہگے کی طرف لپکے تھے۔ ان میں سے یہ روح ہی کھینچ لے، انہیں پراپیگنڈے کا ایسا میٹھا زہر دے کہ ان کے اعصاب مفلوج ہو جائیں، انہیں پیار محبت کے قصے سنائے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے راگ گائے۔ انسانیت کو تقسیم کرنے والی ہر دیوار کو قابلِ نفرت بنا کر بالواسطہ ہر تقسیم کو ختم کر دینے کا سبق دے۔ خوب صورت نعروں میں الجھا کر اصل مقصد کو نظروں سے اوجھل کر دے

اور اپنی اصلی شکل اور اصلی عزائم پر بھی پردہ ڈالے رکھے۔

ہر منگل اور اتوار کو میرے پاکستانی بھائی بہن جس التزام سے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر رام شام کرشن، کنہیا اور گوپیاں بھگوان آرتی اور بھجن سنتے ہیں اور ہندوؤں کی نرمی، سچائی سے محبت، سادگی، قربانی اور ایسے ہی بظاہر دلفریب اور اثر کرنے والے جذبات پر مشتمل کہانیوں پر مبنی فلمیں دیکھتے ہیں، اسے دیکھ کر میں حیران ہوتا ہوں کہ وہ کس سادگی سے یہ شکر چڑھی کڑوی گولیاں نگلتے جا رہے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کی طرح آرٹ کو بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بھی آپ سرحدیں مقرر نہیں کر سکتے — مگر فلم اور ٹی وی، سنگ تراشی اور مصوری، شاعری اور موسیقی سے مختلف قسم کا آرٹ ہے۔ یہ عامۃ الناس کو متاثر کرنے کا آلۂ کار ہے۔ پراپیگنڈے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

ہندوستان کی اوسط درجہ کی، یا کہیے اچھی فلموں —— کیونکہ ان کا تجربہ زیادہ ہے، تکنیکی مہارت بہتر ہے، وہاں زیادہ بہتر ادیب اور فن کار اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ ان فلموں نے پہلا اثر تو یہ کیا ہے کہ ایک عام آدمی بھی یہ کہنے لگا ہے۔ یہ پاکستانی فلمیں — اونہہ، یہ پاکستانی فن کار — ھُو!

یہ ایک ایسا ردِّ عمل ہے جو بہتری کی طرف لے جانے والا نہیں۔ اس کے پیچھے ایک شکست خوردہ ذہنیت ہے مجروح خودداری ایسا ردِّ عمل اختیار نہیں کرتی۔ یہ (SELF CONDEMNATION) کا عمل ہے۔ جب اپنے آپ پر اعتماد اٹھ جائے اپنے آپ پر فخر کر سکنے کی ہمت نہ رہے، سر اونچا کر کے چلتے ہوئے شرم آئے، تو حریف کا آدھے سے زیادہ کام تو ہو گیا۔

سانحہ کے سانحے کے بعد ہم نے اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر اسے کسی اور نہج پر ڈالنے کا کوئی جتن کیا؟ ہم نے اپنی خامیوں کو تلاش کرنے کے لیے کچھ کیا؟ ہم نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھایا؟

ملک آدھا رہ گیا، خزانہ خالی، ملک میں بے یقینی اور مایوسی، شرمندگی اور بیچارگی کی فضا۔ سرحدوں کے اندر دشمن، سرحدوں کے محافظ دشمن کی قید میں۔ اس سے بڑی افتاد کسی قوم پر کیا پڑی ہوگی! اس مشکل وقت میں پیپلز پارٹی اور اس کے قائد نے زمامِ اقتدار سنبھالی۔ اس کے قائد نے ان تھک محنت، بے مثال جرأت اور عالی حوصلگی اور عدیم النظیر فراست اور پامردی سے معاملات سلجھانے شروع کئے۔ قوم میں حوصلہ پیدا کیا، اعتماد بحال کیا۔ لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کے معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے والا بھی کوئی ہے۔ اصلاحات شروع ہوئیں۔ یہ اصلاح، وہ اصلاح، اس محکمے کی اصلاح، اس میں تبدیلی، اُس میں تبدیلی، یہ پراجیکٹ، وہ پراجیکٹ۔

مگر وقت گزرنے کے بعد ملک کے حالات کا جائزہ لیا جائے، تو کیا نظر آتا ہے!

رشوت زیادہ نہیں تو پہلے سے کم بھی نہیں۔ سفارش کے بغیر کسی جائز کام کے ہو جانے کا تصور بھی نہیں۔ عیش پرستی بے راہ روی، مادر پدر آزادی کی منزلوں پر، امن و امان کی حالت ابتر، عام شہری میں عدم تحفظ کا احساس، صنعتی امن کی حالت دگرگوں، ایکسپورٹ اور پروڈکشن کی حالت ناگفتہ بہ، بے ایمانی، چوربازاری، گراں فروشی، غیر ذمہ داری قانون سے بے اعتنائی، عام دستورِ زندگی، یہ کیا طرفہ تماشہ ہے؟ بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب ایں است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

سقوطِ مشرقی پاکستان پر خود احتسابی کا کوئی احساس بیدار نہیں کیا گیا۔ اپنے طریقِ زندگی میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں

کی گئی۔ کسی نے روایتی انداز میں یہ بھی نہ کہا کہ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ اکثر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ بنگال تو ایک نہ ایک دن علیحدہ ہو گا ہی، اور جب وہ علیحدہ ہو گیا تو گویا ایک قدرتی عمل مکمل ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ان کے نزدیک گویا اس سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔

غریب ملک میں ویسے ہی سادگی اور کفایت شعاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب ملک پر اتنی بڑی افتاد پڑی ہو غیر ضروری اخراجات گھٹانے کی ضرورت ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں کہا تو یہی گیا کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں، مگر خرچ کم ہوتا کہیں نظر نہیں آیا۔ چھوٹے لوگوں کی بات نہیں کرتا، کیونکہ یہ تو بڑوں کی بس نقل کرتے ہیں، مثال تو بڑے ہی بنتے ہیں ——— مثلاً وہ حضرات کی کوٹھیوں کی مرمت، از سر نو آرائش اور پھر نئے "ٹھاٹھ باٹھ" وزیروں کی آپس میں کاروں کے انتخاب پر تلخ کلامیوں کی کہانیاں ایسی عام ہوئیں کہ مجھ سے عامی تک پہنچیں، کہ جس کا گزر تک سیاسی حلقوں میں نہیں، اگر یہ باتیں غلط تھیں تو یہ تاثر دور کرنے کی کوشش کیوں نہ کی گئی۔ اور پھر جوں جوں وقت گزرا، ان لوگوں کی شان میں اضافہ ہوتا گیا۔ نئی گاڑیوں کی ریل پیل، لباس کی تراش خراش، سوانا سوٹوں کی کریز۔ ریزسٹنٹ فال۔

عوامی حکومت بنی تھی، عام طبقے کے لوگ وزیر بنے تھے تو کچھ فرق تو محسوس ہوتا۔ دفتر شکایات تو لوگ پہلے بھی کھولتے رہے تھے۔ کھلی کچہریاں ایوب کے وقت میں بھی لگتی تھیں، لیکن جب تک دفتروں اور دفتریوں کا روزانہ کا معمول وہی ہے، وہی بے قاعدگیاں ہیں تو ایسی باتیں وقتی پراپیگنڈے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ لوگوں میں بڑوں کے دیکھا دیکھی وہی مصنوعی معیار رائج رہا۔ انسان کی ضروریات جتنی بڑھاؤ بڑھتی چلی جائیں گی۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور خربوزوں کے اس کھیت میں بھی سب نے مصنوعی معیار زندگی کا رنگ پکڑ لیا۔

پہلے اخراجات آمدنی سے بڑھنے شروع ہو جائیں تو لوگ دیکھتے تھے کون سا خرچ غیر ضروری ہے جسے کم کر کے حساب کتاب برابر رکھا جائے۔ مگر اب دستور ہی کچھ یہ ہو گیا ہے۔ حکومتی سطح پر بھی اور ذاتی سطح پر بھی، کہ اخراجات تو یہی رہیں آمدنی کیسے بڑھائی جائے۔ اور پھر آمدنی بڑھانے کے لئے جائز ناجائز کا تصور بتدریج ختم ہوتا گیا اور اب زور آمدنی بڑھانے پر ہے ذرائع کچھ ہی کیوں نہ اختیار کئے جائیں۔ ساری رشوت، بے ایمانی، چور بازاری کی وجہ تلاش کریں تو آخری کڑی یہیں پر آن ملے گی۔

پارٹی کے ایک بڑے مقتدر رکن سے اختیارات سنبھالنے کے ابتدائی ایام میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ شخصی اور اجتماعی زندگی میں، سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں سادگی کی طرح ڈالئے، نہ کوئی خلیفہ کا لٹھا، نہ دھوتیں، نہ اسکنقابیہ، سارے ملک میں ایک ہی قسم کا کپڑا مقرر کر دیا جائے، جو نفیس قسم کا نہ ہو، عام سا کپڑا ہو۔ وزیر بھی وہی پہنے، سیکرٹری بھی، کلرک بھی، چپڑاسی بھی۔ تاکہ انسان کپڑوں سے نہیں، اپنی کارکردگی سے پہچانے جائیں، جتنا بھی نفیس کپڑا ہماری بڑی شاندار ملوں میں تیار ہوتا ہے، باہر کے ملکوں میں بھیج دیا جائے۔ اسے استعمال کرنے والے بہت سے امیر ملک ایسے ہیں جہاں ایسے کپڑوں کا رواج بھی ہے، استطاعت بھی۔ اور وہاں یہ آتا بھی باہر ہی سے ہے۔ ہمارے ہاں لیبر سستی ہے۔ ہم دوسرے ملکوں کی نسبت ایسا کپڑا سستا دے سکیں گے۔ مگر شاید لیبر نے ان کی بات بھی سن لی اور مطالبات، ہڑتال اور جلسے جلوس کی بات چل نکلی اور رفتہ رفتہ ہماری لیبر بھی ترقی کر کے خوشحال ملکوں کی لیبر کی صف میں آنے لگی۔

ایک شکست خوردہ غریب قوم جس کے ذرائع آمدنی محدود ہوں، جس کا وجود تک خطرے میں ہو۔ وہاں تعیشات زندگی حاصل کرنے کے لئے خوب و ناخوب کا بھی تصور نہ رہے۔ وہاں سمگلر اور غدار نہ پیدا ہوں گے تو اور کیا ہو گا!

میرے صاحب اقتدار دوست نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے قوم میں بے دلی پیدا ہوگی۔ اس میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ ہم پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ہم تنزّل کی راہ پر ہیں۔ ہم کو یہ امپریشن نہیں دینا چاہیئے۔ مگر جو امپریشن انھوں نے دیا اس کا نتیجہ شاید ان کے سامنے نہ ہو، کیونکہ اقتدار کی عینک کے شیشے ہی کچھ ایسے رنگین ہوتے ہیں کہ چیزوں کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیتے ہیں ——— وہ اب اخلاقی بے راہ روی کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بھی اقتصادی مسئلہ ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس بہت روپیہ ہے۔ اس لئے اخلاقی بے راہ روی ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس بہت کم روپیہ ہے اس لئے اخلاقی بے راہ روی ہے۔ اب تو ان کے پاس مجھ سے آدمی کے ملنے کے لئے وقت ہی نہیں ورنہ میں پوچھتا کہ جرمنی اور امریکہ کی طرح جہاں بڑی ہی اقتصادی خوشحالی ہے وہاں پر یہ بے راہ روی اور جرم کا مسئلہ حل ہو گیا ہے جہاں یورپ کی طرح فلاحی مملکتیں (WOLL FARE SATES) وجود میں آگئی ہیں وہاں یہ اخلاقی مسائل اور جرم ختم ہو گئے ہیں؟

ہم نے سارا زور اقتصادیات پر دینا شروع کر دیا ہے اور عقل عیار غلط روی کا جواز ڈھونڈ دیتی ہے۔ کسی رشوت خور کسی ملاوٹیے، چور بازار کرنے والے سے پوچھ لیجئے، وہ اپنے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے معاشرے کے دوسرے شعبوں کی بے راہ رویوں کی بات شروع کر کے اس میں اپنی زیادتیوں کا جواز پیدا کرے گا۔ ایسے میں کسی کو غلطی کی سزا دیں گے تو وہ یہی کہے گا کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور اب تو شاید بائبل کے اس قول کے مطابق کہ گناہ گار کو مارنے کے لئے پہلا پتھر وہی اٹھائے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ سزا کا تصور ہی ختم ہو رہا ہے۔

اقتصادی تبدیلیوں کے سلسلے میں کچھ چیزوں کو قومی تحویل میں لے کر بڑے بڑے دعوے کئے گئے لیکن قومی احساس بیدار کئے بغیر قومی تحویل سے فائدہ؟ جہاں کام کرنے والوں میں یہ احساس نہ ہو کہ جس کارخانے، ورکشاپ یا دفتر میں کام کرتے ہیں اس کا مال اس کا اپنا ہے، غیر کا نہیں۔ اس کا نقصان ساری قوم کے ناطے سے اس کا اپنا بھی ہے کہ وہ بھی قوم کا جزو ہے۔ وہاں بے حسی کا یہی عالم ہوتا ہے جو ہمارے ہاں ہے، کوئی چیز بگڑتی ہے تو بگڑے بلا سے، میری کوئی اپنی ہے۔ کوئی مال چوری ہو رہا ہے تو ہوا کرے، کونسا میرے پلّے سے جا رہا ہے؟ سرکاری مال ہے۔ جب یہ احساس عام نہ ہو جائے کہ سرکاری مال، قومی مال ہے اور قوم کا فرد ہونے کے ناطے اس کی حفاظت ہر شخص کا فرض ہے، کسی چیز کو قومی ملکیت میں لینا انگریزی محاورے کے مطابق گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے والی بات ہے۔

اونچ نیچ کا فرق مٹانا بڑا ضروری تھا۔ اس لئے مجھ سے آدمی نے بھی کہ جس نے سیاست کے پھٹے میں کبھی ٹانگ نہیں اڑائی تھی، مقدور بھر اس جماعت کا ساتھ دیا جو روٹی، کپڑا اور مکان یعنی سماجی انصاف کا نعرہ لے کر آئی تھی۔ اس کے لئے میں بابا جی تک سے بچھڑا، مگر آج اس کے لئے شرمسار ہوں۔ ان کے نزدیک بھی انصاف ہی پہلی (CASUALTY) بنا۔ مکان سر چھپانے کا ٹھکانہ، ہر کسی کو دیا تو ٹھیک ہے، مگر یہ کیا انصاف ہے کہ جس نے جس سرکاری جگہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اسے اس کے مالکانہ حقوق دے دئے جائیں۔ جس نے جہاں جھگی بنالی وہ جگہ اس کی ہو گئی۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ کیا ذہنیت تھی جس نے ان کو سرکاری جگہ پر قبضہ کرنے پر اکسایا۔ کیا ایسے اور حاجت مند نہ تھے کہ جنہوں نے یہ غیر قانونی رویّہ اختیار نہ کیا۔ انھوں نے خود تکلیفیں اٹھائیں۔ اپنی اولاد اور اپنے خاندان والوں کو تنگی میں وقت کاٹنے پر مجبور کیا ذلتیں سہیں، جیسے بھی ہوا گزارا کیا، لیکن قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا۔ کیا یہ لوگ زیادہ حقدار ہیں یا وہ جنہوں نے غیر قانونی طور پر جگہ پر قبضہ کر لیا۔ مشکل یہاں یہی بنی ہے کہ زور حق اور ناحق پر نہیں رہا۔ ہر بات کو غریب اور امیر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ اگر

تانگے والا کوئی قانون توڑے تو اسے غریب سمجھ کر چھوڑ دو۔ کار والا کرے تو اسے پکڑ لو۔ مجرم کو نہیں، امیر آدمی کو پکڑ لو —— دیکھا جائے تو غریب مدد کا صرف اس لئے حقدار ہوتا ہے کہ اس کے حقوق دوسروں نے غصب کئے ہوتے ہیں۔ سوال دراصل انصاف کا ہے ——

تعلیمی اصلاحات نے اسلامی مساوات کا ایک عجیب رخ پیش کیا ہے، جو سکول تھوڑی تھوڑی فیس لے کر پڑھاتے تھے، سب قومی تحویل میں لے لئے گئے ہیں اور جو بہت زیادہ فیس لیتے تھے وہ بدستور آزاد ہیں اور انہوں نے اپنی آزادی کا مظاہرہ فیسوں میں اضافے سے کیا ہے، اب گویا قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلامی مساوات بھی اسلامی امیریلزم کی طرح صرف دو طبقوں والا سماج بناتی ہے۔ بہت امیر اور بہت غریب۔ یا تو آپ اتنا خرچ کر سکتے ہوں کہ بہت امیر لوگوں کے بس کی بات ہو، پھر آپ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوا سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو مجبوراً بغیر فیس کے سکولوں سے مستفید ہوں جہاں تعلیم کا معیار پہلے سے بھی کم ہو گیا ہے۔ اور آئندہ تو حاکم لوگ پبلک سکولوں سے پڑھ کر نکلیں گے جو عوام پر حکومت کیا کریں گے۔ برہمن کشتری ویش اور شودر والی تقسیم تو خیر نہیں، برہمن اور غیر برہمن والی ضرور ہو گئی۔

کوئی اصلاح کارگر نہیں ہو سکتی جب تک خوب اور ناخوب، سچ اور جھوٹ، درست اور نادرست کے پیمانے مقرر نہ کر دئے جائیں۔ جب آپ کے ہاں چھٹانک، سیر اور من کا تصور ہی نہ ہوگا آپ وزن کا اندازہ کیا کریں گے۔ جب انچ فٹ اور گز کا پیمانہ نہ ہوگا، تو کسی چیز کی لمبائی، کسی فاصلے کی طوالت کی سمجھ کیا آئے گی؟

یہ پیمانے، یہ اقدار کہاں سے مل سکیں گی۔ بلاشبہ یہ اقدار ہمیں خدا کی کتاب ہی سے مل سکتی ہیں۔ اسی خدائے علیم وخبیر کے دئے ہوئے پیمانوں ہی سے ہم ہر چیز کو ناپ سکتے ہیں۔ ہر عمل کو جانچ سکتے ہیں، جب تک ان اقدار کے مطابق ہم اپنی سوچ اور ذہن کو تبدیل نہ کریں گے، کوئی اصلاح کارگر نہیں ہو سکتی۔ آپ رشوت، بے ایمانی، چور بازاری کا ایک دروازہ بند کریں گے، دس اور در کھل جائیں گے۔

انقلاب یہی نہیں کہ آپ حکمرانوں کی ایک جماعت کو تبدیل کر کے دوسری جماعت آگے لے آئیں جو زیادہ بلند بانگ دعاوی کرتے ہوں، اس طرح سے تو افغانستان میں تبدیلیٔ اقتدار کو بھی انقلاب کہنا پڑے گا۔ انقلاب تو پہلے ذہنوں میں آتا ہے سوچ کے دھارے بدل دیتا ہے۔ افراد اور اقوام کو تعمیر اور ترقی، ایثار اور قربانی کی راہ پر ڈال کر بلندیوں کی طرف سفر کی نشاندہی کرتا ہے۔ انقلاب تو بڑا ہی تعمیری عمل ہوتا ہے۔ اس سے نہ انتشار بڑھتا ہے نہ خلفشار، نہ ذہنی پراگندگی راہ پاتی ہے نہ اخلاق بے راہ روی، مگر اس کے لئے مثال بننا پڑتا ہے راہ نماؤں کو، اخلاص اور بے لوثی کی سادگی اور شرافت کی اور اس کے ساتھ ہی شب و روز جلوت و خلوت میں بھرپور عملی کردار کا نمونہ بننا پڑتا ہے۔

جب تک آپ ذہنوں میں تبدیلی پیدا نہ کریں گے، نہ رشوت بند ہوگی نہ سفارش، نہ ملاوٹ، نہ چور بازاری، نہ غداری نہ سمگلنگ، قانونی ذرائع آپ کے پاس ہیں۔ انہیں آپ پہلے بھی استعمال کر کے دیکھ چکے ہیں، آئندہ بھی آزما دیکھئے۔ آپ ہر آدمی کے ساتھ ایک سپاہی کھڑا نہ کر سکیں گے، اور کھڑا کر بھی دیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جہاں اب سپاہی کھڑے ہیں، وہاں کیا جرم نہیں ہوتا؟ ایسا کیوں ہے، قانونی ڈھانچہ ہے، کارندے ہیں مگر جرم بدستور قائم ہی نہیں ترقی پذیر ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کم از کم اس وطن عزیز میں کسی کو یہ سمجھانے میں دقت نہیں ہو سکتی۔

اور پھر سپاہی کہاں کہاں آپ کے ہمراہ ہو سکتا ہے؟ محفلوں میں، گلیوں اور بازاروں میں تو ایسا ممکن ہے۔ گھر کی

چار دیواری کے اندر جرم پرورش پا رہا ہو۔ گھر کے رہنے والے گھر کو جرم گاہیں بنانے پر صدقِ دل سے تلے ہوئے ہوں تو سپاہی کیا کرے گا۔ اور نہاں خانۂ دل میں اگر چور ہو، تو محتسب کیا کر سکتا ہے؟ صحیح انقلاب تہیں کام آتا ہے۔ وہی دلوں کو تبدیل کرتا ہے، جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ وہاں پہنچ سکتا ہے یہ معجزے اسی سے ممکن ہیں۔

ابھی ماہِ رمضان گیا ہے، روزہ دار بھوکا ہوتا ہے، پیاسا ہوتا ہے۔ حلال کی کمائی کی روٹی بھی اس کے پاس ہے تنہائی ہیں جہاں اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ ٹھنڈا پانی اس کے ہاتھ کی پہنچ میں ہے، مگر وہ اسے چھوتا تک نہیں۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کا خیال تک نہیں کرتا۔ اسے کس نے باز رکھا؟ کیا کوئی محتسب، کوئی سپاہی اس پر متعین تھا۔ یقیناً نہیں۔ محض اس کا ایمان تھا کہ خدا دیکھتا ہے، جہاں کوئی اور نہیں دیکھ سکتا خدا وہاں بھی دیکھتا ہے۔

اگر آپ یہی بات زندگی کے ہر دوسرے شعبے اور ہر میدان پر محیط کر لیں کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں، خدا دیکھتا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ وہ تو نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے تو دیکھئے زندگی کیسے بدل جاتی ہے۔

غیب، نگاہ سے اوجھل چیزوں ہی کو تو کہتے ہیں اور مومن تو قرآن کے پہلے پارے کی پہلی ہی سورۃ میں یومنون بالغیب کہتے ہیں۔ اگر ہر سمگلر کو یہ یقین ہو کہ خدا دیکھتا ہے۔ اگر ہر ملاوٹیے کو یقین ہو کہ خدا اس کی ہر بات ہر حرکت سے آگاہ ہے اور پھر اسے یہ یقین بھی ہو کہ وہ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکتا اور اسے خدا کا یہ دعویٰ بھی معلوم ہو کہ تم بچ کر کہاں جاؤ گے، جا سکتے ہو تو ہماری کائنات کی حدوں سے باہر نکل کر دکھاؤ، تمہارا تو ہر اُٹھنے والا قدم تمہیں ہماری ہی طرف لا رہا ہے۔ اس کا یہ ایمان ہو کہ آخر ایک روز اسے اپنے خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے جہاں اس کا اعمال نامہ کھلی ہوئی کتاب ہوگا۔ وہ خود اپنے خلاف گواہ ہوگا تو اس کا ہاتھ خود بخود جرم سے رُک جائے گا۔ اس کا دل خود بخود اپنے فاسد خیالات پر شرمسار ہوگا اور اس کی پیشانی از خود عرقِ انفعال سے بھر جائے گی، اس کی نگاہ خود بخود جھک جائے گی اور وہ اپنے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرے گا، اپنے لئے مغفرت کا طلبگار ہوگا۔

آج سارے رشوت خور، سارے ملاوٹیے، سارے سمگلر، سارے مجرم ——— ان سب کے نام مسلمانوں ہی کے نام ہیں۔ یہ ہمارے ہی معاشرے کا جزو ہیں۔ ہم ہی میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ان میں کئی مسجدوں میں رکوع و سجود میں بھی ملیں گے۔ باپ دادا کے وقت سے مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھو تو کہیں گے الحمدللہ، وہ مسلمان ہیں، خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

مگر یہ کیسا ایمان ہے جو انہیں جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ کیسا ایمان ہے کہ ان کا عمل یومنون بالغیب کی نفی کرتا ہے۔ یہ کیسا ایمان ہے کہ یوم حساب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ خالی خولی لفظی ایمان ہے جو دل میں کہیں نہیں؟

ہم نے اسی سال میں ایک عظیم فیصلہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھا ہے کہ کچھ لوگ جو خود کو مسلمان کا حصہ کہتے تھے، ایک بنیادی عقیدے سے انحراف کے باعث پارلیمنٹ کی طرف سے غیر مسلم قرار دئے گئے۔ میں اس بات سے بہت خوش ہوں کہ یہ فیصلہ حکومتی سطح پر کیا گیا۔ عائلی قوانین کے بعد یہ دوسرا فیصلہ ہے جو حکومت نے کیا ہے۔ کسی مفتی یا مولوی یا کسی مولویانہ ادارے یا گروہ کے سپرد نہیں کیا گیا۔ مسلمان ملکوں میں مسلمانوں کی چنی ہوئی حکومت کو حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے سب اختیارات ہونے چاہئیں۔ ان میں شخصی و مجلسی، دینی اور دنیوی کی کوئی تفریق

(باقی [illegible] پر)

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء

...گر تو بُرا نہ مانے!

چوہدری عطاء اللہ ایڈووکیٹ

سقوطِ ڈھاکہ برِّعظیم کے مسلمان کی پیشانی کا وہ داغ ہے جس نے اس سرزمین پر ہمارے پُرشکوہ ماضی کی عظمت کو گہنا دیا۔ مشرقی پاکستان نے اپنے چہرے پر بنگلہ دیش کی نقاب ڈال لی۔ ہمارا یہ بازو جسدِ ملّت سے کٹ گیا اور بھارتی سامراج کی نحوست کے تاریک سایوں میں کھو گیا۔ ہندو کو موقعہ ملا کہ ہمارے انتشار کو دو قومی نظریہ کے خلاف ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کرے۔ پاکستان کا نمک کھانے والے "جعفرانِ ایں زماں" جو پاکستان بن جانے کے بعد مصلحتاً متقار زیرِ پر تھے ان کی زبانوں کو بھی اذنِ عام ملا۔ سرحدی گاندھی کے بیٹے نے مصرع اٹھایا "دیکھا ہم نہ کہتے تھے۔ اسلام کو بنائے قومیت نہ بناؤ۔ تم نے ہماری بات نہ مانی۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اب تم ایک شکست خوردہ قوم ہو۔ بیٹھے ہوئے اپنے زخم چاٹا کرو۔ اور ہاں بات کو سقوطِ ڈھاکہ پر ہی ختم نہ سمجھو۔ پاکستان کی مزید شکست وریخت کے لئے بھی تیار رہو۔ ہم بچے کھچے پاکستان کو بھی متحد نہ رہنے دیں گے۔ پاکستان میں اب بھی ایک نہیں چار قومیں بستی ہیں۔ یہ تو غالباً تم جانتے ہی ہو گے کہ کوئی سی قومیت جب بھی چاہے اپنی علیحدگی اور اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کا اعلان کر سکتی ہے۔

سرحدی گاندھی کے یہی صاحبزادے عبدالولی خان صاحب پاکستان کی قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے لیڈر بھی ہیں۔ ان کی اپنی جماعت نیشنل عوامی پارٹی کے علاوہ جو کہ نہ صرف ملک میں چار قومیتوں کے وجود کی قائل ہے بلکہ اپنے منشور کی رُو سے ملک میں سیکولر نظامِ حکومت لا کر پاکستان کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی فکر میں ہے۔ اس حزبِ اختلاف میں بعض ایسی جماعتیں بھی شامل ہیں جو نظریۂ پاکستان کی حامی ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن عبدالولی خان اور ان کی جماعت کے نظریات کے پیشِ نظر تو ولی خان کی سربراہی میں حزبِ اختلاف میں شامل دیگر جماعتوں کی نظریۂ پاکستان سے وفاداری بھی محلِ نظر ٹھہرتی ہے۔

جہاں تک حکمران جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کا تعلق ہے، نظریۂ پاکستان پر اس کے اعتماد و یقین پر پہلے شک نہ کیا جائے لیکن اس پارٹی کے راہنماؤں اور وابستگان کے آئے دنوں کے بیانات اور اقدامات اس امر کی غمازی ہیں کہ ان کے اپنے درمیان اتحادِ فکر مفقود ہے۔ نظریۂ پاکستان سے وفاداری کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن باوجود بے پناہ اقتدار و اختیار کے اس نظریہ کو محسوس پیکروں کی صورت میں سامنے لانے کی توفیق تو اب تک مسلمان کو بھی ارزاں نہیں ہوئی۔ یہ پارٹی اسلام کو اپنا دین، جمہوریت کو اپنی سیاست اور سوشلزم کو اپنا نظریۂ معیشت قرار دیتی ہے۔ ابتدا میں انہوں نے اسلام کو مذہب کا نام دیا، لیکن بعد میں مذہب کی بجائے دین کی اصطلاح استعمال کرنے لگے۔ ابھی پچھلے دنوں پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل نے اپنے ایک بیان میں انکشاف کیا کہ یہ تبدیلی ان کی تجویز پر عمل میں آئی تھی۔ لیکن افسوس کہ پارٹی کے یہ معزز عہدیدار اور ان کے ساتھی

اس اصطلاح کی وسعتِ معانی (CONNOTATION) سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر حقیقت میں وہ لفظِ دین کے مطالب و معانی کی گہرائی و گیرائی سے آگاہ ہوتے تو یہ اعلان کرنے کے بعد کہ اسلام ہی ہمارا دین ہے۔ ان کی جماعت کو اس نعرہ زنی کی حاجت نہ رہ جاتی کہ جمہوریت ہماری سیاست اور سوشلزم ہمارا نظریۂ معیشت ہے۔ اگرچہ سوشلزم کی اصطلاح کو بھی بعد میں اسلامی سوشلزم کا نام دے دیا گیا۔ لیکن بات وہیں کی وہیں رہی۔ بلکہ اس سے تو بگاڑ اور بھی بڑھ گیا۔ اسلامی سوشلزم تو یوں جانئے کہ ایسے ہی ہے جیسے "اسلامی دروغ" یا "اسلامی فریب کاری" وغیرہ

اصل بات یہ ہے کہ اگر اسلام کو بطورِ دین کے اختیار کیا جائے تو سیاسی امور اور معاشی مسائل کے حل کے لئے کسی دیگر اصطلاح کے استعمال اور کسی دیگر نظریے کو اپنانے کی حاجت نہیں رہتی۔ جو لوگ قرآن سے منحرف نہیں، کلامِ اقبال پڑھتے ہیں اور اس کے اشعار سے اپنی تحریر و تقریر کو مزیّن کرتے اور پُر اثر بناتے ہیں اور پاکستان اور بانیٔ پاکستان سے اپنی عقیدتمندی کے اظہار میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے، یہ سادہ سی بات آخر ان کی سمجھ میں آتی کیوں نہیں!

بانیٔ پاکستان نے اشتراکیت اور اسی قسم کے دیگر سیاسی و معاشی مسالک کے بارے میں دوٹوک انداز میں فرمادیا تھا کہ وہ درحقیقت اسلام اور اس کے نظام کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں، جن میں اسلامی نظام کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔ اور پھر قائداعظمؒ ہی کے الفاظ میں ایک اسلامی ریاست میں، جیسے کہ پاکستان ہے، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے قائداعظمؒ کے پاکستان میں کسی بھی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں کی معیشت کو قرآن کی بجائے سوشلزم کی تابع فرمان بنانے کی کوشش کرے۔ ہمارے یہاں کے اربابِ سیاست اور کار پردازانِ حاکمیت سیاسی ہنگامہ آرائی اور جمہوریت کے پردے میں کاروبارِ شہریاری کی اپنی بے پناہ مصروفیات سے چند لمحات بچا کر تدبرِ قرآن کر سکیں، تو یہ چند ساعتیں اس حقیقت کو نکھار کر ان کے سامنے لے آئیں گی کہ قرآنی نظریۂ معاش و اقتصاد سوشلزم اور کمیونزم سے کہیں بڑھ کر انقلاب انگیز اور انقلاب آفریں ہے۔ حاملینِ قرآن کا انسانیت کے دکھوں کا مداوا سوشلزم اور کمیونزم میں تلاش کرنا تو ان کو اقبال کے اس شعر کا مصداق ٹھہرائے گا ؎

کعبہ پہلو میں ہے اور سودا ئیٔ بتخانہ ہے　　کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا تیرا!

رہی جمہوریت تو اس کی اصل و حقیقت کو حضرتِ علامہ نے چٹکیاں لیتے ہوئے انداز میں یوں آشکارا کیا ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

سوشلزم کے ابلاغ اور فلسفۂ جمہوریت کے فروغ نے اسلام گریز رجحانات اور ملت میں انتشار و افتراق کی ترویج کے سوا آخر ہمیں دیا کیا ہے؟ جمہوریت کے زیرِ سایہ پرورش پائی ہوئی سیاست اب سیاسی جماعتوں کو اس مقام تک لے پہنچی ہے کہ یہ جماعتیں عوام میں انتشار و افتراق پھیلانے کی حدود کو پھلانگتی ہوئی غیر ملکی طاقتوں تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئی ہیں۔ ان کی ان مذبوحی حرکات سے پاکستان اور مفادِ ملت کو ضرر پہنچتا ہے، تو پہنچا کرے، ان کی بلا سے، انہیں تو بہرحال اور بہر طور اپنے سیاسی مخالفوں کو سرنگوں کرنا ہے اور ان کو مسندِ اقتدار سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لینا ہے خواہ اس کے لئے اسلام دشمن

طاقتوں کا آلۂ کار ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ جب غیر ملکی سفارت خانوں کے دروازوں پر دستک دینے والے سیاست دانوں پر چہار طرف سے لعن طعن ہوئی تو ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی جماعت کے صوبائی امیر نے متحدہ محاذ کے اس فعلِ شنیع کی صفائی اور مدافعت میں ایک بیان داغ دیا جو ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے نوائے وقت میں شائع ہوا۔ بیان یوں تھا: "وزیراعظم کہتے ہیں کہ انہوں نے اپوزیشن میں رہتے ہوئے کبھی کسی غیر ملکی سفارت خانے سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ حالانکہ حیدرآباد کنونشن منعقدہ ۱۹۶۹ء میں بھٹو صاحب نے خود بتایا تھا کہ وہ بھارتی سفیر کے پاس گئے تھے۔ پھر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے دوران بھی بھٹو صاحب نے بار بار فوج سے کہا کہ وہ خونریزی سے اجتناب کرے۔ اگر اقتدار سے باہر ہوتے ہوئے ان کے لئے یہ جائز تھا تو متحدہ محاذ کے لئے بھی ناجائز نہیں ہے۔" عذرِ گناہ بدتر از گناہ اسی کو کہتے ہیں۔ مقدسین کا یہ طائفہ اپنی ہر بد اعمالی کا جواز اب اپنے مخالفین پر جوابی الزام کی صورت میں پیش کیا کرے گا!

گزشتہ ربع صدی میں یہاں کی سیاسی جماعتوں سے جس سیرت و کردار کا اظہار ہوا ہے اور جس کا ایک نمونہ سطورِ بالا میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی ہے کہ مغربی طرزِ جمہوریت کا تجربہ یہاں قطعی طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ لیکن سیاستیین ہیں کہ اس سراب سے نکلنے کو تیار نہیں۔ قرآن نے ملت کے اندر فرقہ سازی اور پارٹی بازی کو عظیم ترین معصیت (شرک) کا نام دیا۔ لیکن اسلام ہی کے نام پر سیاست کا کھیل کھیلنے والی جماعتیں، گروہ سازی اور پارٹی بازی کی بنیاد پر پھلنے والی جمہوریت کی مدح سرائی میں سب سے پیش پیش ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے رہنما یہ رونا روتے ہوئے بھی اکثر سنے جاتے ہیں کہ ملت انتشار کا شکار ہے۔" اندرونِ ملک اتحاد و یکجہتی حاصل کئے بغیر بیرونی جارحیت کا دفاع ممکن نہیں۔" ان کے اقوال و افعال کا تجزیہ کیجئے تو دیکھئے گا کہ وہ اس نوع کے بیانات کے باوجود پارٹی بازی اور گروہی سیاست سے دست کش ہونے کو تیار نہیں تو اس لئے کہ سرداری اور لیڈری کی لذت کوشی سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔ پارٹیاں ختم ہو جائیں تو ان بونے لیڈروں کی کھیپ بھی باقی نہ رہے گی۔ نااہل اور مفاد پرست راہنماؤں کی دکانِ سیاست جس کی وافر گنجائش مغربی طرزِ جمہوریت میں پائی جاتی ہے بے پارٹی کی سیاست میں چل نہ سکے گی۔ اس لئے ان غرض کے بندوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سیاسی پارٹیوں کو ختم کر کے عوام کو اپنی ابلہ فریبیوں سے نجات دلانے پر تیار ہو جائیں گے۔ امید موہوم ہے۔ تاہم راقم پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ان کا ایک وعدہ یاد دلانا چاہے گا۔

قریب پانچ برس قبل کی بات ہے کہ بھٹو صاحب پارٹی کی تشکیل و تنظیم کی خاطر ملک کا دورہ کرتے ہوئے ساہیوال بھی تشریف لائے۔ جہاں اپنے اعزاز میں دئیے گئے ایک عصرانہ میں انہوں نے حاضرین سے خطاب فرمایا تو راقم نے ان سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ سوال یہ تھا کہ قرآن نے پارٹی سازی کو ایک جرمِ عظیم کی حیثیت دی ہے لیکن اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اس ملک میں ہماری شامتِ اعمال سے پہلے ہی بہت سی پارٹیاں موجود ہیں جو ملت میں انتشار و افتراق کے اسباب پیدا کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور آپ اب ہمیں ایک نئی پارٹی کے قیام کی نوید سنا رہے ہیں اور اس میں شرکت کی دعوت دے رہے ہیں۔ پارٹی سازی کے خلاف قرآن کے واضح احکام کی موجودگی میں ایک جدید پارٹی کی تشکیل کا آخر جواز کیا ہے؟ بھٹو صاحب کا جواب یہ تھا کہ اس وقت ملک میں متعدد سیاسی پارٹیاں موجود ہیں اور ملکی سیاست جس اسلوب پر چلائی جا رہی ہے

اس کے پیشِ نظر میں نے بھی ایک پارٹی قائم کرلی ہے۔ میں برسرِ اقتدار آیا تو اس بات کا ضرور جائزہ لیا جائے گا کہ قرآن کی رُو سے پارٹیوں کا وجود باقی رہنا چاہیئے یا نہیں۔ ہمارا فیصلہ قرآن ہی کے مطابق ہوگا۔

پیپلز پارٹی کو انتخابات میں جو حیران کن کامیابی حاصل ہوئی بھٹو صاحب ہی کی پُرکشش شخصیت کی مرہونِ منت تھی۔ پارٹی کو ان کی ذات سے الگ کرکے اس کے اندرون نگاہ ڈالئے تو خلا ہی خلا دکھائی دے گا۔ بھٹو کا اقتدار پارٹی کی وجہ سے نہیں بلکہ پارٹی کا اپنا وجود بھٹو کی ذات سے قائم ہے۔ پیپلز پارٹی کا یہ نعرہ کہ اسلام ہمارا دین ہے بھٹو ہی کا عطا فرمودہ ہے۔ دینِ اسلام اپنے اس فرزند سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی اس مملکت میں خلافِ قرآن موجود پارٹیوں کو ختم کرکے خلافتِ علیٰ منہاجِ رسالت اور حکومت بالمشاورت کا اہتمام کیجئے۔ ملّتِ پاکستان کی آنکھیں آج ایک ایسے راہ داں راہنما کی راہ تک رہی ہیں جو خلافِ قرآن مغربی طرزِ جمہوریت کے باطل تصورات سے وجود کشی پارٹیوں کے سراب سے نکل کر قرآن کی متعین کردہ راہ پر چلنے کا عزم اور حوصلہ رکھتا ہو۔ اس راہ میں بچھائے گئے کانٹے تو مدت ہوئی طلوعِ اسلام نے چن لئے۔ منزل خود پکار رہی ہے آؤ۔ بڑھتے چلے آؤ۔

اس مرحلہ پر راقم کی نگہ پلٹ کر ایک بار پھر قیامِ پاکستان اور اس کے ربع صدی بعد سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر جا ٹھہرتی ہے۔ پاکستان کا قیام اقوامِ عالم کی نگاہوں میں ایک اعجوبہ سے کم نہ تھا۔ کرۂ ارض کو محیط مسلماتِ سیاستِ افرنگ کے علی الرغم ہم نے اپنے دین کو اپنی قومیت کی بناء ٹھہراتے ہوئے برعظیم میں اپنے لئے الگ وطن قائم کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہم نے اہلِ دنیا کو تاثر یہ دیا تھا کہ وہ قوم جو رسمِ دنیا سے ہٹ کر اس نرالی مملکت کو وجود میں لائی ہے اسے قائم و برقرار رکھنے میں بھی ناکام نہ ہوگی۔ لیکن سقوطِ ڈھاکہ سے اقوامِ عالم کا ہم پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ ربع صدی پر پھیلی ہوئی ہماری بداعمالیوں کے نتائج کے ظہور کا نقطۂ تکمیل تھا۔

ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا سقوطِ ڈھاکہ فی الواقعہ دوقومی نظریہ کی تکذیب پر منتج ہوا ہے یا ملک کے دو حصوں میں بٹ جانے سے نظریۂ پاکستان کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ درست جواب پانے کے لئے ہمیں قیامِ پاکستان کی غرض و غایت کو سامنے لانا ہوگا۔ ہم آغازِ مطالعہ مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبال کے اس خطبۂ صدارت سے کرتے ہیں جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ سنہ ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر دیا۔ اس خطبہ میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اسلام برعظیم میں بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اس صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کردیا جائے اور یہ اس لئے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ وہ خطہ یا علاقہ جہاں برعظیم کے اندر علامہ اس نظامِ حکومت کو (بطور قدمِ اوّل) نافذ کرنا چاہتے تھے آپ کا موجودہ پاکستان ہی تھا جو پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہے۔ علامہ کے نزدیک پاکستان احیائے اسلام کی کوشش کا نام تھا۔ جیسا کہ اسی خطبہ میں فرمایا کہ اس اسلامی ریاست کے قیام سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرارت عطا کرسکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ اقبال، جیسا کہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں، وطنیت کے سخت ترین دشمن تھے۔ برعظیم میں ان کے تصور کی اسلامی ریاست کے قیام سے کرۂ ارض پر موجود اوطان میں ایک نئے وطن کا اضافہ مقصود نہ تھا بلکہ اس خطۂ زمین کو ایک عالمگیر اسلامی ریاست کے قیام کے لئے بطور (NUCLEUS) کام میں لانا تھا۔ اختصار کی غرض سے بانیٔ پاکستان کی صرف ایک

تقریر کا ایک جملہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تقریر قائد اعظم نے نومبر ۱۹۴۵ء میں فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کر رہے ہیں کہ اس مملکت میں اپنے ضابطۂ زندگی، اپنی ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مفکرِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے افکار و نظریات سے صاف عیاں ہے کہ برِعظیم میں اسلامی ریاست کے قیام کی غرض ایک مخصوص فکر کو محسوس پیکروں کی صورت میں ڈھالنا تھا۔ فکر تو اب بھی اپنے اصل انداز میں موجود ہے اور ربِ کریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ خطۂ ارض بھی جسے اقبال کی آرزو کے مطابق اس فکر کے فروغ کا محور و مرکز بننا تھا ہر گزند سے محفوظ ہے۔ البتہ سقوطِ ڈھاکہ سے ہمیں جو سبق حاصل کرنا چاہیئے تھا وہ ہم نے حاصل نہیں کیا۔ قیامِ پاکستان سے ہمارے فکر و عمل میں جو تبدیلی آنی چاہیئے تھی وہ تبدیلی نہ تو سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ہم نے اپنے اندر پیدا کی اور نہ اس کے بعد ہم نے اس کے لئے کوئی کوشش کی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے حالات کا جائزہ لیجئے تو دکھائی دے گا کہ نظریۂ پاکستان کی تکذیب سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے بھلے ہی ثابت نہ ہو پا رہی ہو لیکن ہمارا عمل تو ضرور اس کی رسوائی کا باعث ہو رہا ہے۔ یہاں اس ضمن میں بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو پیش آمدہ ایک واقعہ کا تذکرہ یقیناً عبرت آموز ہو گا۔ میجر صدیق سالک نے "ہمہ یاراں دوزخ" کے عنوان سے بھارت میں اپنے ایامِ اسیری کی داستان رقم کی ہے۔ بھارتی حکومت نے جنگی قیدیوں کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک کیا وہ ان لوگوں کے لئے باعثِ تعجب نہ ہو گا جو ہندو کی ذہنی فطرت سے آگاہ ہیں۔ بہرحال جو واقعہ یہاں بیان کرنا مقصود ہے وہ کچھ اور ہی نوعیت کا ہے۔ قیدیوں کے سروں سے "پاکستان کا بھوت اتارنے" اور ان کی ذہنی کایا کلپ کے لئے قید خانے میں حکومت کے افسر، سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما قیدیوں سے بات چیت کرتے اور دورانِ گفتگو دو قومی نظریے کی "لغویت" اور ہندو اور مسلمان کے اتحاد و اتفاق کی باتیں کرتے اور پاکستان پر بھارت کی برتری کا ان کے سامنے اظہار کرتے، لیکن ہمارے جیالے ان کی اس ہرزہ سرائی سے متاثر ہونے کی بجائے انہیں منہ توڑ جواب دیتے اور یہ ناصحین ناکام و نامراد واپس لوٹ جاتے۔ ایک روز قیدیوں سے کہا گیا کہ آج ایک نہایت قابلِ احترام دینی راہنما[1] تشریف لا رہے ہیں جو سیاسی چھیڑ خانی کی بجائے قیدیوں کو مذہبی بصیرت عطا فرمائیں گے۔ یہ بزرگ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شیخ الجامعہ یا وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب[2] تھے۔ پروفیسر صاحب نے قیدیوں کے سامنے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر بھارت) سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا اور پھر تقسیمِ ہند کی بات کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نہرو یا ذاکر حسین سے کسی ذاتی منفعت کی خاطر بھارت میں نہیں رکا بلکہ یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا کہ اسلام کے پرچار کی ضرورت پاکستان کی نسبت بھارت میں زیادہ ہے۔ اگر ہم سب پاکستان چلے گئے تو اس خطۂ ارضی میں اسلام کی تبلیغ کون کرے گا۔ آخر میں انہوں نے بھارت میں فروغِ اسلام کے لئے اپنی خدمات کا ذکر کیا۔ اور جب وہ

---

[1] یہ قابلِ احترام دینی راہنما شروع ہی سے کٹر مارکسسٹ (دہریہ) تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) سے بھی زیادہ متشدد کانگریسی۔ (طلوعِ اسلام)

[2] یہ صاحب اسلام کے لامذہبانہ ایڈیشن کے مبلغ ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

اپنی بات ختم کر چکے تو میجر صدیق سالک اور ان کے ایک اور ساتھی میجر مرزا نے پروفیسر صاحب سے جو سوال کئے ان میں سرفہرست میجر صدیق سالک کا یہ سوال تھا " جناب والا! کیا آپ مجھ جیسے دنیادار کی راہنمائی کے لئے اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے کہ کیا اسلام کے مقاصد میں اسلامی معاشرے کی تشکیل بھی شامل ہے ۔ اور اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ کیا غیر اسلامی حکومت کے زیر سایہ ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے؟"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا " میرے خیال میں اسلام میں اسلامی معاشرے یا اس قسم کی کسی چیز پر زور نہیں دیا گیا۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی فرد کی اصلاح کے لئے آیا۔ ہاں اگر سب افراد مومن ہو جائیں تو خود بخود مومنوں کا معاشرہ پیدا ہو جائے گا۔ جہاں تک غیر اسلامی حکومت کی رکاوٹ کا تعلق ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ جو لوگ پاکستان چلے گئے انہوں نے وہاں کون سا اسلامی معاشرہ قائم کر لیا ہے ؟"

مقاصدِ اسلام کے بارے میں پروفیسر مجیب کے خیالات سے قطع نظر ان کے جواب کا آخری فقرہ ہماری روشِ بے عملی اور بداعمالی پر ایک بھرپور طنز ہے۔ پروفیسر کا جواب پڑھ کر راقم نے تو یوں محسوس کیا کہ بھارت میں اپنی بے پروبالی کے اظہار کے ساتھ ہی استاد نے نالائق شاگرد کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہے اور اس تھپڑ کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اسے ذہن میں رکھا جائے کہ یہ شاگرد پروفیسر مجیب کا نہیں، اقبال اور جناح کا ہے۔

بقیہ "آئینہ کیوں نہ دوں ..." صلا سے آگے

نہیں ہونی چاہیئے۔

اگر ختم نبوت پر ایمان نہ ہونے سے کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا اور میرا ایمان ہے کہ یقیناً کوئی منکر ختم نبوت مسلمان نہیں ہو سکتا، تو آخرت پر ایمان سے علاً منکر اور لیومنون بالغیب کا زندگی بھر تمسخر اڑانے والا کیسے اس مقدس دائرے کے اندر رہ سکتا ہے! کاش کوئی پارلیمنٹ اس کا بھی فیصلہ کرے۔

ایک نظریاتی مملکت میں اس نظریے پر جو اس ملک کی اساس ہو یقین نہ رکھنے والے آج کی دنیا میں اول تو رہ ہی نہیں سکتے (سوشلسٹ ملک اس کی مثال ہیں) اور اگر انہیں رہنے بھی دیا جائے تو وہ اس کی پالیسیوں میں دخل انداز کبھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان پالیسیوں کی تشکیل جن باتوں پر مبنی ہوتی ہے وہ اس پر یقین ہی نہیں رکھتے ـــ تو ایسے سب لوگ جو اسلام پر ایمان نہیں رکھتے ـــــ آخر اسلام ایک نظریہ، ایک طریقِ زندگی، ایک دین ہے، جو زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے، خالی خولی عبادات کا مجموعہ نہیں ـــــ اس پر یقین نہ رکھنے والے کیسے یہاں کے قانون ساز اداروں میں دخل انداز ہو سکتے ہیں؟ ہمیں اس مملکت کی نظریاتی اساس کو محکم کرنا ہوگا۔ پھر ہی اس کے دنیاوی اور مادی استحکام کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ نظریے پر ایمان رکھنے والے لوگوں کی جاں نثار جماعت جو اس کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار ہو، موجود ہو تو مادی وسائل بھی سامنے آئیں گے۔ وسائل پیدا ہوں گے تعمیر ہوگی۔ سچ مچ کی تعمیر اور ترقی جس کا نور گھر گھر پھیلے گا اور ایسے لوگوں پر مشتمل ملک ناقابلِ تسخیر ہوگا۔ کوئی اس کی بنیادوں کو (UNDERMINE) نہ کر سکے گا۔ کوئی اس کے باشندوں کو ان کے ایمان کی راہ سے نہ ہٹا سکے گا۔ کوئی انہیں دبا نہ سکے گا۔ کیونکہ انسان مر بھی جائیں تو جذبہ زندہ رہتا ہے۔

بقیہ "مجلس مذاکرہ"

(ص ۴۶ سے آگے مسلسل)

جاتا ہے ———— میں یہ کہہ رہا تھا کہ بساطِ سیاست پر نوجوانوں نے اپنے سرمایۂ جذبات سے جو نفاقتی کھیل کھیلا یہ ایسا نہیں تھا کہ ان کے قلب و دماغ کی گہرائیاں اس کے ہولناک ردِّعمل سے محفوظ رہ سکتیں۔ ناممکن تھا کہ ان کے سیرت و کردار کی پہنائیوں میں اس کے جراثیم اپنا اثر نہ چھوڑتے۔ طاقت کے نشے میں ہلڑ بازی کی روش اور اپنے کو مسدود پا کر سرپٹ بھاگ نکلنے کی مصلحت کوشی۔ یہ دونوں صورتیں مل کر انسانی سیرت اور قومی کردار کو منافقت کا گھن لگا دیتی ہیں۔ اور یہ گھن لگ چکا ہے۔ اس کے نتائج بھی قومی تاریخ میں مرتب ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ ہے ان درس گاہوں کے تعلیمی ماحول کا اثر جن میں کسی قوم کی تشکیل نو اور کسی قوم نو کی تشکیل ہوتی ہے۔

معزز خواتین و حضرات! ہماری ستائیس سالہ آوارہ گردی نے آج ہمیں جس فیصلہ کن مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ اس ذہنی و فکری انحطاط کی صاف صاف نشاندہی کر رہا ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی دور رس راہ قومی قیادت کے خود ساختہ مدعیوں کے دل و دماغ میں موجود نہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی مخصوص ذہنی تربیت اور سیاسی مصلحت کوشیاں انہیں اجازت نہیں دیتیں کہ وہ مغرب کے لائے ہوئے نظریات و تصورات اور خود ساختہ مذہب کے اعتقادات سے ہٹ کر قرآن العظیم کے اس باب عالی پر دستک دے سکیں جو بانیٔ پاکستان کے الفاظ میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے۔

میرے دوستو اور ساتھیو! میرے نزدیک نو بازآفرینی کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کے حوالے سے تشکیل شدہ نصاب تعلیم اور اس تعلیم کے لئے صاف ستھرا ماحول اور مذہبی پیشوائیت کی بیخ کنی ہے ———— جب تک یہ نہیں ہوتا، اس قوم کی بازآفرینی بہت مشکل ہے۔ یہی وہ بات ہے جو محترم باباجی عرصہ سے کہتے چلے آ رہے ہیں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان کی آواز کو وقتی طور پر ملّا اپنے کفر کے فتوؤں اور ڈھکوسلوں کے زور پر دبانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ لیکن مخالف قوتوں کی برق رفتاری روشنی سے اس مینار کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اور یہ مردِ قلندر اپنے رب کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر مسلسل آگے بڑھتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ قوم کو یہ بھی بتاتا گیا کہ وہ چراغ جنہیں مذہبی پیشوائیت نے گل کر کے اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے۔ وہ گل شدہ چراغ دوبارہ جلیں گے تو فضا کی تاریکیاں چھٹیں گی اور نہ صرف پاکستان کے عوام اپنے مقصد کو پا لیں گے بلکہ انسانیت سکھ کا سانس لینے کے قابل ہو گی۔ یعنی قرآن کی مستقل اقدار کو منشورِ حیات بنانا۔

جنہیں حقیر سمجھ کے بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء

مجلسِ مذاکرہ

(قسط دوم)

موضوع: یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

۶۔ توصیف احمد خان

بزرگانِ کرام سلام ورحمت!

میرے لئے یہ باعثِ صد افتخار ہے کہ میں طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن کے اس مذاکرے میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں۔ یہ لمحے میری زندگی میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

صاحبِ صدر و محترم سامعین! آج کے مذاکرے کا عنوان ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

میں جب اس موضوع پر لکھنے کے لئے بیٹھا تو خیالات کی یلغار تھی جسے مختصر الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تھا۔ ذہن میں ہزاروں سوالات ابھرے اور پھر بے ساختہ قلم کے ذریعے صفحات پر پھیلتے چلے گئے۔ اس سے پہلے میری آواز گنبد کے اندر کی آواز تھی جو صرف مجھے ہی اونچی سنائی دیتی تھی لیکن اب ایسا نہیں۔ مجھے گونا گوں خوشی ہے کہ آج آپ بھی میری اس آواز کو سن رہے ہیں۔ محترم سامعین! اب آئیے اصل موضوع کی طرف!

پیدائش کے اعتبار سے میں والدین کی آغوشِ محبت میں پرورش پانے کے بعد جب توتلی زبان سے کچھ الفاظ ادا کرنے کے قابل ہوا تو والدین کی انگلی چھوڑ کر بے سہارا چلنے لگا۔ پھر مجھے تربیت کے لئے ایک ایسی ہستی کے سپرد کر دیا گیا جو استاد کہلاتا ہے۔ گویا یہ دوسری بھٹی تھی جس میں مجھے تربیت کے لئے پانچ سال تک رہنا پڑا۔ اس تربیت کے دوران میری زبان اور اطوار کی نوک پلک درست کی گئی۔ ذہن پر راکھ مل جاتی رہی تاکہ یہ خوب چمک سکے۔ اور یہ کام ایک ایسے ماہر کے حوالے کیا گیا جو بذاتِ خود ذہنی تھا جس کی اپنی ترقی رک گئی تھی جو خود علم سے محروم رہ گیا تھا اور جو نانِ شبینہ کا کچھ اس طرح محتاج تھا کہ اس کی نگہ ہر وقت اس تلاش میں رہتی کہ کس کا والد کیا کام کرتا ہے اور اس کا کون سا کام اس کے والد سے حل ہو سکتا ہے۔ یہ ہستی دستِ سوال دراز کرنے سے نہیں ہچکچاتی تھی۔ ایسے ماہر کے ہاتھوں پانچ سال کی اس طویل مدت میں کم از کم میری آدھی صلاحیتیں اس چمکانے والی راکھ میں مل گئی ہیں اور ایسی معدوم ہوئیں کہ پھر ابھرنے کا نام نہیں لیتیں۔ بعد ازاں پرائمری کے مراحل طے کرتے کے

بعد مجھے ایک نئی تجربہ گاہ میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں مجھ سے یہ توقع کی جاتی رہی کہ میں قصرِ علم کے دروازے میں سے گزر کر اس قصر کے ان گنت علوم کے بحرِ خشک میں ٹامک ٹوئیاں کھاتا ہوا غریقِ جہالت ہو جاؤں یہی وہ نازک مرحلہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا کہ:-

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو ۔ ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
اس کے لئے کہ سے
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

سامعینِ کرام! میں اگرچہ تعلیم کے اس تیزاب میں دس سیڑھیاں طے کر چکا ہوں لیکن میری خودی میں اتنی لچک نہیں کہ اسے جدھر چاہے پھیر لیا جائے۔ ابھی اس میں کچھ مزاحمت باقی ہے۔ اس کی وجہ باباصاحب کی وہ تصانیف ہیں جن کا میں اکثر و بیشتر مطالعہ کرتا رہا ہوں اور یہ بے تاب تمنا لئے شریک کنونشن ہوا ہوں کہ تحریک طلوعِ اسلام کے قصرِ علم میں اور محترم باباصاحب کی آغوشِ تربیت میں تعلیم پا کر دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولنے کے قابل ہو سکوں۔ طلوعِ اسلام کے مجوزہ کالج کے سوا دیگر ملکی تعلیمی اداروں میں ہمارے وجود کو "تجلیِ افرنگ" بنانے کے پورے امکانات موجود ہیں۔

معزز سامعین! اب چلئے ان تربیت گاہوں پر نظر ڈالتے ہیں جہاں قوم کے شاہین عجیب ذہنی خلفشار اور ان گنت مسائل سے دوچار ہیں۔ ان مسائل کے پیدا کرنے میں آدھا ہاتھ اُن خود غرض اور مفاد پرست سیاستدانوں کا ہے جنہوں نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے طلبہ کو آلۂ کار بنایا۔ ان گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے سیاست دانوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لئے طلبا کو سونے کی چڑیا سمجھ کر ان کے گرم خون سے ہولی کھیلنے کی ایک بہترین مثال قائم کی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تقریباً ہر سیاسی پارٹی نے ہمارے کالجوں اور سکولوں میں اپنی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ وہ طلبا کو ہر قسم کی مالی امداد بھی دیتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر اسلحہ بھی!

دوسری طرف ہمارے طالب علموں نے بھی حکومت کے ہر جائز و ناجائز کام میں ٹانگ اڑانا اپنا فرضِ منصبی سمجھ لیا ہے۔ آپ کسی بھی کالج میں چلے جائیں تو وہاں آپ کو دیواروں پر نعرے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہمارے طلبا ہی نہیں بلکہ ہمیں تربیت دینے والے بھی اس سیاست بازی کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں آ کر میں اپنے طالب علم بھائیوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ آیا تعلیمی ادارے کارخانے اور ملیں ہیں۔ جہاں مزدور مالکان کے خلاف یونینز بناتے ہیں؟ اور یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ ہمارا بنیادی مقصد اور نصب العین صرف اور صرف حصولِ علم ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ باشعور اور پڑھے لکھے شہری کی حیثیت سے ہم کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم ملکی امور میں دلچسپی لیں اور ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔

سامعینِ کرام! میں نے باباصاحب کی تصنیف کردہ کتاب "قائداعظم کے تصور کا پاکستان" میں پڑھا ہے کہ طلبا نے پاکستان کے حصول کے لئے جان، مال اور وقت کی جو عظیم قربانیاں دیں اس کی مثال تاریخِ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ اگر نوجوان خون کو صحیح خطوط پر سوچنے کا موقع دیا جائے تو اس سے لالہ و گل پھوٹتے ہیں۔ قومیں بقا اور ترقی و استحکام حاصل کرتی ہیں۔

معزز سامعین! تعلیمی اداروں میں سیاسی شعبدہ بازی کے بعد میں اس نصاب تعلیم کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتا ہوں جو آج کل ہمارے ہاں رائج ہے۔ بلاشبہ علمی پستی کا موجودہ بحران ناقص نصاب تعلیم کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آج کا طالب علم محنت کرنے کی بجائے نقل اور اسی طرح کے دوسرے حربے استعمال کر کے پاس ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کسی بھی کالج میں چلے جائیں وہاں آپ کو کلاسیں خالی ملیں گی اور طلبا یا تو ہوٹلوں میں یا پھر کسی گرلز کالج کے سامنے چکر لگاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سکولوں میں اساتذہ، طلبا کو ڈنڈے کے زور پر سبق رٹا کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے۔ ہماری پڑھائی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بے اندازہ تعطیلات ہیں۔ اول تو تعلیمی اداروں کو ہڑتال ہی سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کالج کھلا بھی ہو تو وہ طلبا کے واک آؤٹ کی نذر ہو جاتا ہے۔ دوسری بڑی وجہ آئے دن کی سرکاری چھٹیاں ہیں اس طرح سال میں تقریباً چھ ماہ تعلیمی ادارے ان ہی تعطیلات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ باقی مہینوں میں کورس کی موٹی موٹی کتابوں کو پڑھنا ہمارے لئے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ نصاب کی غیر ضروری کتابیں بھی ہمارے لئے دردِ سری ہوئی ہیں مثلاً اگر میں سائنس پڑھتا ہوں تو مجھے ان دوسرے مضامین پر بھی توجہ دینی پڑتی ہے جو آگے چل کر طالب علم کا کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر غیر قانونی طریقے سے پاس ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔

ہمارے اساتذہ کرام جب پرچے بناتے ہیں تو ان کی بہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ پرچے کو اس قدر مشکل بنا دیا جائے کہ طالب علم صحیح طور پر اس کا جواب نہ دے سکے یا پھر وہ طلبا پر اپنی قابلیت جتانے کے لئے سوال کو ہیر پھیر کر ایسا پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ طالب علم سوالات ہی میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنی سال بھر کی محنت کو تین گھنٹے کے پرچے میں گوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

سامعین کرام! کالج میں ہمیں مغربی فلسفہ حیات پڑھایا جاتا ہے اور مغرب کی ہر شے کو رنگین و پرکشش بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کالج میں پہنچنے والے ذہن کا نقشہ علامہ اقبال نے بالکل صحیح کھینچا ہے ؎

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری — اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

مغرب کے فلسفۂ حیات کی معراج یہ ہے کہ تخلیق کا کوئی مقصد نہیں اور اس سفرِ حیات کا کوئی منتہی نہیں۔ ایسا فلسفہ حیات انسانیت سے گرا کر ایسے پست مقام پر لے آتا ہے جہاں افراد اور قوموں میں یہ صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ وہ تعمیری کام سرانجام دے سکیں۔

معزز سامعین! میں نے سرزمین پاکستان پر آنکھیں کھولی ہیں اور جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے والدین سے یہی سنتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ سرزمین پاکستان "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" کے نام پر لی گئی تھی لیکن جب میں صرف اپنے طالب علم بھائیوں کو اسی سرزمین پر قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

معزز سامعین! مروّجہ نصاب تعلیم نے آج تک ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن معزز سامعین! مقام افسوس ہے کہ آج ہمارے طالب علموں نے اپنے آپ کو مسلمان ماننے ہی سے

انکار کر دیا ہے۔ وہ کانگریسی لیڈر جو شروع ہی سے چار قومیتوں کا نعرہ الاپتے چلے آرہے ہیں۔ اب نوجوان طبقے نے اسے کافی حد تک قبول کر لیا ہے اور آج وہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ کہلانے میں زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات ایٹم بم سے بھی زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہے لیکن کوئی بھی ان لیڈروں سے سختی سے باز پرس کرنے والا نہیں جو کہ قوم کو انتہائی شارٹ کٹ راستے سے اندوہناک تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

محترم سامعین! آج ہمارے تعلیمی اداروں میں نصاب تعلیم کی جو تعلیم دی جا رہی ہے اس سے علم کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اس بوسیدہ نظام تعلیم سے ہمیں کچھ حاصل نہیں۔ اگر ہمیں اس علم سے کچھ حاصل ہوتا تو ہم ہی سب سے پہلے چاند پہ قدم رکھتے۔ ہم ہی سب سے پہلے ایٹمی دھماکہ کرتے۔ ہم مشرقی پاکستان دینے کی بجائے کشمیر اور سارا ہندوستان لے چکے ہوتے۔ بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں نہ ہوتا۔ فلسطین میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد نہ ہوتا اور فلپائن میں مسلمانوں کا قتل عام نہ ہوتا۔

خواتین و حضرات! آج یقیناً قوم کو ہمیں لڑکے اور لڑکیوں کی بجائے محمد بن قاسم اور ٹیپو سلطان کی ضرورت ہے لیکن میرے بزرگو! یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ اس فرسودہ نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے یقیناً آج کے ہم نوجوان آپ کی توجہ کے مستحق ہیں اور صحیح راہنمائی کے محتاج و متلاشی۔ خدا کے لئے آپ قوم کے ان ابھرتے ہوئے ستاروں کو بے یار و مددگار مت چھوڑ کر جائیے۔ آج مستقبل کے ان معماروں میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ کسی فرعون کا مقابلہ کر سکیں۔ بلکہ وہ محض اس فرعون کے دست و بازو بن کر اس کے مشن کو تقویت دے رہے ہیں اور یہ ایسے ادارے ہیں جو شیر کو بھیڑ بناتے ہیں اہم کردار انجام دے رہے ہیں اور اس خوب صورتی سے کام کر رہے ہیں کہ نہ خون بہتا ہے نہ الزام عائد ہوتا ہے ایسی کالج سے ... ... فرد کے بارے میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

تیرا وجود سراپا تجلی افرنگ — کہ تو وہاں کی عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے خالی ہے — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

ایسا ہی نظام تعلیم اگر فرعون کو مل جاتا تو واقعی اس کو بچوں کے قتل کی ضرورت نہ پڑتی اور جوان صرف زندہ نظر آتے جیسے آج آپ کو نظر آرہے ہیں بقول علامہ اقبالؒ ؎

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے — مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

والسلام

۷۔ ثریا عندلیب

حاضرین کرام۔ السلام علیکم۔ امسال ہماری طلوع اسلام کنونشن کے مذاکرے کا عنوان اس موضوع سے متعلق ہے جو ہمارے حال کی ایک تلخ ترین حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگرچہ کہنے کو تو یہ ایک ہلکا پھلکا سا شعر ہے۔ سہل اور سادہ الفاظ پر مشتمل جو برسوں پہلے اکبر الہ آبادی نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کرتے ہوئے سر سید احمد خان کے قائم کردہ کالج کے خلاف کہا تھا ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ بات اس وقت سچی تھی یا جھوٹی اور شاعر کا یہ احساس و خیال برحق تھا یا نہیں۔ اس پر بحث کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ آپ تو زمانے کا یہ ستم دیکھئے کہ حالات کے الٹ پھیر کے بعد آج ہماری درسگاہوں، تعلیمی اداروں اور سکول کالجوں پر یہ بول قطعی صادق آتے ہیں۔ اور یہی وہ سنگین مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ دینا آج کے وقت کی پہلی اور اہم ضرورت ہے۔ اس سے پیشتر ہم نے اپنی اس محفل قرآنی میں گزشتہ بہت سے مذاکروں میں زندگی کے بیشتر حقائق اور گہرے فلسفوں پر غور و فکر کیا تاکہ وحی قرآنی کے تابع عقل انسانی کی روشنی میں اپنی باجماعت زندگی کو کامیاب و سرفراز بنا سکیں۔ مگر اس کی کرنوں سے عملی طور پر ہم نے اپنی ذات کو کتنا منور کیا اور اپنے گھروں میں کتنا اجالا پھیلایا۔ گستاخی معاف! اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ع صورت جلیں ،،بالہ مہ ہیں! بہرکیف آج کی اس نشست میں تو ہمیں یہ آسانی میسر ہے کہ گفتگو کرنے کے لئے ہمیں ایک موضوع دیا گیا ہے کہ جس پر ہم والدین کی کوئی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کئے بغیر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ سکتے ہیں تو آیئے دیکھیں اس ناہموار راستے میں وہ کون سے روڑے پتھر ہیں کہ جن سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے ہمارے بچوں کو گزرنا پڑ رہا ہے اور اس تعلیمی زندگی کی وہ کون سی خود ساختہ مشکلات و صعوبات ہیں کہ جو ان کے وجود کو تو نہیں مگر ان کے قلوب و اذہان کو ہر آن ضرور قتل کرتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں بات کی ابتدا لامحالہ مجھے ان سکول کالجوں کے ذکر سے کرنا ہوگی جو ہمارے بچوں کی تعلیم و تدریس کے لئے اپنے وطن عزیز میں خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں جہاں ان کے بچپن سے لے کر جوانی تک لکھائی پڑھائی سیکھنے اور مختلف علوم و فنون حاصل کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پھر رونا کس بات کا ہے؟ اور کیا چاہیئے؟ جی ہاں۔ آپ بھی سچ کہتے ہیں لیکن ذرا سنئے! یہ جو میں نے انتظام لفظ بولا بس یہی وہ مقام ہے جہاں رک کر ہمیں سوچ اور سمجھ کے ساتھ یہ جائزہ لینا ہے کہ یہ کیسا نظام تعلیم اور انتظام تدریس ہے کہ جس کے نتیجے میں ہمارے یہ بچے یعنی طلبا اور طالبات بہتر سوجھ بوجھ اور متوازن دل و دماغ کے ساتھ بلند کردار کے حامل ہونے کی بجائے منتشر ذہن و مضطرب قلب لئے معاشرے کی عام زبان میں آوارہ گرد، سرکش، شورش پسند کہلاتے ہیں اور کالجوں و یونیورسٹیوں میں آئے دن ہنگامے بپا کرنا، ہلڑ گلہ مچانا ان کا گویا مشغلہ بن چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اضطراری و ہیجانی کیفیت سے گزرتے رہنے والے طالب علموں کے اذہان ثابت و سالم نہیں رہ سکتے بلکہ ان کے ذہنوں کے اندر بے چینی و بے یقینی اور عدم اعتماد کی توڑ پھوڑ جاری رہتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ ایسے انتشار و خلفشار کے ہاتھوں ان کی ذہنی صلاحیتوں کا قتل مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب ہمارا طالب علم طبقہ ہمارے زیر تعلیم لڑکے لڑکیاں اس ابتری کا شکار ہو جائیں تو پھر آپ ہی بتایئے ہماری قوم کی بقا اور سلامتی کا انحصار کس پر ہوگا؟ رونا اسی بات کا ہے اور یہاں میں آپ کو ایک مفکر کا یہ قول بھی یاد دلاؤں جس نے کہا تھا کہ کسی قوم کو شکست محاذ جنگ پر نہیں اس کی درسگاہوں میں ہوتی ہے۔ غور کیجئے کہنے والے نے کیا بات کہی ہے؟ کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ قوم کو بنانے یا بگاڑنے میں اس کی درسگاہیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری قومی درسگاہوں کا نظام تعلیم و تہذیب قوم کے بچوں کو سنوار رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے۔ بنا رہا ہے یا مٹا رہا ہے! مسلمان ہونے کے ناطے اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے بچوں کو ان کے بچپن سے سکولوں میں کس قسم کی اسلامی دینیات سے روشناس کروایا جاتا ہے کہ جس

کے نتیجے میں ایسے ایسے توہمات وخرافات ان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں جو بالغ وباشعور ہو جانے پر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ جن بچوں کو ان کے قرآنی فکر کے حامل والدین انہیں گھروں میں قرآنی تعلیم کے مطابق اسلامیات کے اسباق دیتے رہتے ہیں تو وہی بچے جب سکولوں میں اس کے بالکل برعکس اسلامیات حاصل کرتے ہیں تو ان کے ذہن جھنجلا اٹھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ پھر اگر وہ امتحان میں گھر کی ملی ہوئی تعلیم کے مطابق سوالوں کا جواب دیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتے اور اس کے بعد انہیں اسی جھوٹ کا سہارا لے کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ ٹیڑھی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یوں ان بچوں سے ان کی جوانی میں صدق وراستی کی توقع رکھنا محض خیالِ خام ہے۔ سکولوں کے بعد کالجوں اور یونیورسٹیوں پر نظر ڈالئے تو وہاں بھی اسلامی تعلیم کا منہج واسلوب وہی ہے جو ہماری غلامی کے دور میں وضع ہوا تھا اور جسے مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس اسلامی تعلیم سے طالب علموں کو کچھ غلط یا صحیح معلومات تو ضرور حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اسلامی دین کی روح سے وہ بالکل ناواقف اور قرآنی تعلیم کی حکمت اور غرض وغایت سے وہ قطعی بے بہرہ رہتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کے علاوہ ہمارے ہاں مذہبی مدارس کا بڑا نام ہے جہاں کے فارغ التحصیل علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کی دینِ اسلام سے واقفیت کا یہ عالم ہے کہ جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ تو ان میں سے بعض تو فی الفور جواب ہی نہیں دے سکتے اور جو دیتے ہیں تو ان میں سے ایک کا جواب بھی دوسرے کے جواب سے میل نہیں کھاتا۔ شہادت کے لئے منیر کمیٹی کی شائع شدہ تحقیقات موجود ہیں۔ تو حضرات! آپ نے دیکھا کہ اس نظامِ تعلیم کی یہ چھوٹی بڑی درسگاہیں ہمارے طالب علموں یعنی قوم کے ایک با صلاحیت طبقے کو اسلامی تعلق سے کس ڈگر پر ڈال رہی ہیں اور اپنی اس کارکردگی سے قوم کو بنانے و سنوارنے کا فرض کس طرح پورا کر رہی ہیں!! مگر یہ تو تصویر کا صرف ایک رُخ ہے ورنہ اپنے ہاں تو عام طور پر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک کے جو حالات ومعمولات شب وروز رہتے ہیں ان سے کسی طور بھی علم وفن حاصل کرنے والوں کو ذہنی آسودگی وبالیدگی میسر نہیں آتی بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ بظاہر تعلیم کی روشنی پھیلانے والی ان دانشگاہوں کے اندر اس قسم کی بے قاعدگیاں ونا ہمواریاں ہوتی ہیں اور مقصدِ تعلیم کو نظر انداز کر کے نفسِ خویش کی خاطر ایسی ایسی دھاندلیاں مچتی ہیں، اس طرح کی بدعنوانیاں سرانجام پاتی ہیں کہ ان کے تحت قائم ہونے والی مسموم فضا سے طلبا وطالبات کے ذہن جلا نہیں پاتے جلا دئیے جاتے ہیں۔ پھر یہ جلے بھُنے ذہن اگر ملک میں شہر شہر اور بستی بستی شور وشر کیا کرتے ہیں۔ نت نئے ہنگامے اٹھاتے ہیں۔ ہر طرح کا ڈسپلن توڑ پھوڑ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بداخلاقی کے مظاہرے کرتے ہیں تو ان کی ان حرکاتِ مذمومہ پر طعن وتشنیع کرنے اور نالاں ہونے کا ہم کیا حق رکھتے ہیں۔ جب ایک صانع اپنی ذمہ داری سے مجرمانہ غفلت برتتا ہے تو اس کی صنعت کیونکر صحیح شکل وصورت میں ڈھل سکتی ہے اور آرائش وستائش کی حامل ہو سکتی ہے؟ آپ جانئیے! قوم کے بچے تو اس خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے آپ جو چاہے بنالیں۔ یہ تو وہ پگھلنے والی دھات ہے جسے جس قالب ڈھالنا چاہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اب اگر ان تعلیمی اداروں سے نکلے ہوئے نوجوان اس تخریبی شکل میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں تو سوچنے کی بات ہے یا نہیں کہ اس امر کا ذمہ دار اور اس خرابی کا قصوروار دراصل کون ہے؟

پاکون ہیں؟ طریقہ تعلیم سے قطع نظر آپ دیکھئے کہ اوّل تو لاکھوں روپے خرچ کرنے اور سالہا سال لگانے کے بعد جو بھی اچھا بُرا نصاب ترتیب پاتا ہے۔ اس کی صورت اکثر و بیشتر یہ ہوتی ہے کہ پڑھائی کا سال گزرتا چلا جاتا ہے مگر کتابیں شائع نہیں ہو پاتیں۔ طالب علم بیچارے بازاروں کے چکر لگا لگا کر وقت کا زیاں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بالآخر یہ خزانہ اس وقت دستیاب ہوتا ہے جب پڑھنے کا وقت باقی نہیں رہتا اور سیشن قریب الختم ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ پھر ان اساتذہ پر نظر ڈالئے جو اپنے فرائضِ منصبی کو بھلا بیٹھتے ہیں جو صرف اپنے حقوق منوانے کے لئے اپنے منصب و وقار سے نظریں پھیر کر غیر آئینی ہتھکنڈوں پر اُتر آتے ہیں جو طالب علموں کو پڑھانے میں دلچسپی لینے کی بجائے ٹریڈ یونین بنانے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت بیان بازیوں میں گنواتے ہیں۔ کالجوں کے لانوں میں بیٹھ کر دھوپ سینکتے ہیں۔ اکثر کلاسوں سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ اگر بادلِ نخواستہ کلاسوں کا رُخ کرتے بھی ہیں تو لیکچر تیار کئے بغیر جو کچھ طالب علموں کے ذہن نشین کروا سکتے ہیں اور جیسی ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اسے ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے۔ نصاب کے تعلق سے یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ امتحانوں کے وقت تک کورس ختم نہ ہو سکنے کی جو شکایت عام ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں سرکاری چھٹیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ آج موسم بہار کی چھٹیاں منائی جا رہی ہیں تو کل سالانہ کھیلوں کی چھٹیاں آ رہی ہیں۔ کبھی امتحانات کی تیاری کے لئے چھٹیاں ارزانی ہوتی ہیں تو کبھی موسم گرما کی تعطیلات میں ملکی حالات اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک محتاط اندازے کے مطابق سرکاری لازمی اور ہنگامی چھٹیوں کے سبب دو سال کی بجائے صرف چھ ماہ کا تعلیمی پیریڈ رہ جاتا ہے۔ کوئی کورس ختم ہو تو کیونکر؟ اب امتحانات کو لیجئے کہ یہاں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارے اس دور میں تو یہ شعبہ بھی آلودگیوں کی نذر ہو چکا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ رشوت و سفارش کا عمل دخل جس طرح یہاں جاری و ساری رہتا ہے اس نے قوم کی لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ کیا غضب ہے کہ ممتحن منہ مانگے دام وصول کر کے یا بے مانگے موٹی رقم حاصل کر کے غلط جوابات کے پورے سے پورے نمبر لگانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں مل کر علم کی عظمت و حرمت کے پرخچے اڑا دیتے ہیں۔ مگر شرم و ندامت سے کسی کی نگاہ نہیں جھکتی۔ کسی کا دل نہیں لرزتا۔ سب پر بے حسی و جمود طاری رہتا ہے اور مذکورہ کاروبار برابر چلتا رہتا ہے۔ یہ سودا بازی مستقل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہین، قابل اور محنتی طالب علموں کی محنت و ذہانت غارت ہوتی چلی جاتی ہے جس کا ان پر نفسیاتی اثر بد یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی محنت و عرق ریزی کو بے کار سمجھ کر اس سے دامن چھڑا لیتے ہیں پھر یا تو اسی ملوث گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں یا اپنے مستقبل سے بے یقین ہو کر مایوسی و نامرادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ جس پہلو سے بھی دیکھئے۔ اندھیرا ہی سامنے آتا ہے۔ امتحان شروع ہونے سے پہلے پرچوں کا افشاء ہو جانا کیا دفتری عملہ کی لاپرواہی کا نتیجہ نہیں؟ کمرۂ امتحان میں نقل کے مواقع مہیا کرنا کیا سپروائزروں کا شیوہ نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ان مکروہات میں آج کے بگڑے ہوئے طالب علموں کا بڑا ہاتھ ہے اور ہزار افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کئی ایسے بھی ننگِ انسانیت نفوس ہیں جو چاقو اور چھروں کی نوک پر یہ ذلیل حرکات عملہ متعلقہ سے کرواتے ہیں اور بے خوف و خطر معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ بات یہاں تک پہنچی کیوں؟

کیا اس کی شرمناک ابتدا میں ان درسگاہوں کے استاد شامل نہیں ؟ کیا ان شاگردوں کے والدین اس انتہائی خرابی میں شریک نہیں ؟

جی ہاں - والدین ! آپ کہیں گے کہ آغاز کلام میں تو والدین کو اس ذمہ داری سے مُبرّا قرار دے دیا تھا اور اب انہی پہ زور دے رہی ہو - تو عرض یہ ہے کہ شروع میں شاید لاشعوری طور میں نے اپنا بچاؤ کیا تھا ورنہ اس مسئلے کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت سے کیسے آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں کہ ان درسگاہوں کو مقتل گاہیں بنانے میں کم و بیش والدین بھی بری الذمہ نہیں - جب والدین اپنے بچوں کو سکولوں کالجوں میں بھیج کر خود یوں بے فکر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے اب بچوں کے متعلق ان کے کرنے کا کوئی کام ہی نہیں رہا تو وہ اپنے اس اہم فرض کو بھول جاتے ہیں کہ جو اس صورت میں ان پر عائد ہوتا ہے کہ وہ کم از کم مہینے میں ایک دفعہ ان کے سکول کالج جا کر ان کے استادوں سے پوچھ کر ان کی تعلیمی و اخلاقی حالت سے باخبر رہیں ، تاکہ والدین کی اس خبر گیری سے استاد بھی اپنے شاگردوں کی طرف پوری توجہ رکھیں اور شاگردوں کو بھی اپنے محاسبے کا دھیان رہے مگر مختلف معاشی و معاشرتی مشکلات کو سدِّ راہ بنا کر ماں باپ یہ فرض پورا کرنے سے معذرت چاہتے ہیں بلکہ بعض کو تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کا کون سا بچہ کس جماعت میں زیرِ تعلیم ہے - ہاں ! مگر وہ دوسری طرف ایسے ہی ماں باپ اپنے اوپر یہ فرض لازم قرار دیتے ہیں کہ سالانہ امتحانات کے دنوں میں مختلف مضامین کے الگ الگ ایگزیمنروں سے پتے حاصل کریں تا کہ ان کے پاس جا کر ان کے گھروں میں حاضری دے دے کر رشوت و سفارش کے بل بوتے پر اپنے نااہل اور غیر مستحق بچوں کو زائد نمبر لگوا کر پاس کروایا جائے - پہلی دوسری پوزیشن دلوائی جائے حقداروں کا حق چھین کر ان کے لئے ڈگریاں حاصل کی جائیں - اپنی اس کارکردگی کے لئے انہیں زیادہ سے زیادہ دقت دینے جگہ جگہ جانے اور دوسرے شہروں تک پہنچنے میں دریغ نہیں ہوتا - کیا ایسے والدین قابلِ معافی ہیں ؟ اپنے حصے کے اس مختصر وقت میں میں اس کربناک موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پورا تجزیہ نہیں کر سکتی - اس مذاکرے میں طلبا و طالبات آپ کے سامنے خود اپنی تعلیمی دشواریاں بیان کریں گے تو ہر بات کھل کر سامنے آ جائے گی اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا آسان ہو گا - تاہم مجھے اخیر میں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے ان نوجوانوں کی ذہنی آوارگی ، سرکشی ، شر انگیزی یا الفاظ دیگر حرماں نصیبی و سوختہ بختی کہیں عالمِ بالا سے اچانک ہی نازل نہیں ہو گئی - یہ کسی ایک دن کی پیداوار نہیں - یہ رفتہ رفتہ اور بتدریج اس انتہا تک پہنچی ہے اور بلاشبہ اس کا واحد سبب تعلیم کے مسئلے سے ہمارا مجرمانہ تغافل ہے - تشکیل پاکستان سے لے کر اب تک ایک پوری نسل اس کی لپیٹ میں آ چکی ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس نسل کے بعد آنے والی نسل یعنی آج کے بچوں کو بھی اسی ریگ زار سے گزرنا ہے اور اسی راستے کی ریت پھانکنی ہے جب تک کہ موجودہ درسگاہوں کا موجودہ نظامِ تعلیم قائم ہے - اس موقع پر دل یہ سوال کرتا ہے کہ ہمارے دانش در ، علم و فضل کے ماہرین ! اس قافلے کی قافلہ سالاری کی ذمہ داری کب سنبھالیں گے ؟ ہم آخر کب تک قوم کے اس قیمتی اثاثے کو لٹتے دیکھیں گے ؟ ان نونہالوں کو بیچ منجدھار کر کب تک اپنی قوم کو پوری تباہی سے بچا سکیں گے ، اور رب العالمین کب تک ہمیں مہلت دیتا چلا جائے گا ؟ آخر کب تک ؟ سامعین گرامی قدر ! جواب چاہتی ہوں ؟

۸۔ محمد فیروز طاہر ملتان

اور اک اشک گرا ٹوٹ کے چشمِ تر سے ‏ ‏ ‏ اور اک دل کی تمنا کا جنازہ نکلا

مندمل کر نہ سکا وقت کا مرہم اس کو ‏ ‏ ‏ ہم نے جس زخم کو چھیڑا وہی تازہ نکلا

محترز سامعین! ایک خواب ایسا ہے جسے میں باقاعدہ وقفوں کے بعد بار بار دیکھتا ہوں۔ اندھیرا ہے اور مجھے کسی جھاڑی میں قتل کیا جا رہا ہے ایک سڑک پر جس کا فاصلہ دس گز سے زیادہ نہیں۔ آمدورفت جاری ہے۔ میں مدد کے لئے چیختا ہوں لیکن میری آواز کوئی نہیں سنتا۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم ہنستا اور باتیں کرتا گزر جاتا ہے۔

مجھے معلوم ہے ہم میں سے بہت سے لوگ اسی قسم کے خواب دیکھتے ہیں۔ جب انسان کا تشخص تشدد سے دوچار ہوتا ہے تو اسے بنیادی تنہائی کا احساس ہوتا ہے مگر وہ اپنے اس تجربہ کی دہشت کو دوسروں تک پہنچانے سے عاجز ہوتا ہے۔ یہ خواب انہی کیفیتوں کا مظہر ہے (علاوہ ازیں مجھے یہ بھی یقین ہے کہ) آخر آپ لوگ ہی تو وہ ہجوم ہیں جو سڑکوں پر ہنستا ہوا گزر جاتا ہے۔ ہماری آواز کبھی کبھار آپ کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے اس وقت ہم آپ کے چہروں پر خاموش حیرانی دیکھ کر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آواز آپ تک پہنچ گئی ہے۔ شاید ہم چیخنے والے گردوپیش کی حقیقتوں کو زیادہ صحیح طور پر سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ہر زمانہ میں چیخنے والے ہوتے رہے ہیں۔ پیغمبر، واعظین اور مصلحین سب ہی اپنے ہمعصروں کی کند ذہنی کی مذمت کرتے رہے ہیں اور صورت حالات کا پیمانہ ہمیشہ بڑی حد تک یکساں ہی رہا ہے۔ چیخنے والے ہمیشہ چیختے رہتے ہیں اور گزرنے والے گزرتے رہتے ہیں۔ ان کے کان ہوتے ہیں مگر سنتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر دیکھتے نہیں۔

اکبر الہ آبادی بھی اپنے دور کا ایک بہت بڑا مصلح تھا۔ وہ اپنے سینے میں ایک حساس دل رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عصرِ حاضر کی نام نہاد دانش گاہیں تہذیبِ مغرب کا گہوارہ ہیں۔ ان دانش گاہوں میں علم تو ملتا ہے۔ روشنی نہیں۔ تعقل تو ملتا ہے تجسس نہیں۔ جمال تو ملتا ہے جلال نہیں۔ آرام و سکون تو ملتا ہے سوز و دروں نہیں۔

دانشِ حاضر کی ظاہری چمک جو ذہن کو منور اور دل کو تاریک کرتی ہے جسم کو جگاتی اور روح کو سلاتی ہے اور یہی چیز قتل ہے جو جسمانی قتل سے زیادہ فکر رس، زیادہ جان لیوا اور زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ایک ایسا تہذیبی، ثقافتی اور روحانی قتل ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ذہنی انتشار، اخلاقی بے راہ روی، روایات سے بغاوت، تن آسانی، بے عملی، آرام طلبی اور مذہب سے بیگانگی اسی قتل کے نتائج ہیں۔

ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ہماری علمی دانش گاہوں اور ادبی اداروں کا نظامِ تعلیم ایک خاص دور کی پیداوار ہے جو ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر وضع کیا گیا تھا۔ یہ نظامِ تعلیم سات سمندر پار سے آنے والی قوم نے اس سرزمین پر اپنی استحصالی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے رائج کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد مذہب سے بیگانہ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے نوکر چاکر پیدا کرنا تھا جو بیرونی حاکموں کے ہاتھ مضبوط کر سکیں اور اپنی ملکی اور قومی اقدار سے قطعی نا آشنا ہوں، جو اپنے تاریخی اور ثقافتی ورثے سے بالکل عاری اور تہی دامن ہوں جو دوسروں کے ذہن سے سوچیں اور دوسروں کی زبان سے بات کریں جو دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اور دوسروں کے لباس میں اترائیں۔ اپنے تمدن کو حقیر جانیں اور دوسروں کی تہذیب پر فخر کریں۔

وہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ابھی تک ہمارے تعلیمی اداروں سے ایسی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر قسم کی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جو شرقی ہے نہ غربی، بلکہ مشرق اور مغرب کا ایک عجیب و غریب امتزاج ہے۔ یہ کوّے ہنس کی چال چلنا چاہتے ہیں مگر چل نہیں سکتے اور یہی ان کا المیہ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ نظامِ تعلیم جو صدیوں پہلے ہم پر مسلّط کیا گیا تھا ہم آج بھی اس کے شکنجے میں اسیر ہیں۔ تعلیمی اداروں میں صلاحیتوں کے قتل، وقت کے ضیاع، روح و ضمیر کی تاریکی اور اخلاقی گمراہی کے سوا کچھ نہیں رکھا۔

ان حالات میں ہمارے کیا فرائض ہیں۔ ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ میں بھی اسی مغربی تہذیب کا پروردہ ہوں۔ میں بھی اس نوجوان نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس نے اپنی روایات کو ٹھکرا دیا ہے اور جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ میرا لباس وہی ہے جو دوسروں کا ہے۔ میرے آدابِ معاشرت بھی وہی ہیں جو دوسروں کے ہیں لیکن مجھ میں اور دوسروں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ میرا ضمیر ابھی زندہ ہے لیکن حق گوئی اور بے باکی کے لئے جان کی بازی لگانا پڑتی ہے کیونکہ اس معاشرے میں حق گوئی کی سزا موت ہے اور میں ابھی کچھ دیر زندہ رہنا چاہتا ہوں ؎

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی   خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

۹۔ نیاز محمد خان ۔ کوئٹہ

معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم۔

آج مجھے جس موضوع پر بولنے کی دعوت دی گئی ہے اس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ دراصل یہی وہ چیز یا ذریعہ ہے جس سے قوموں کے عروج و زوال پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا کہ ہم اس میں اسلامی اصولوں کو عملی طور پر متشکل کر کے دنیا کو دکھا سکیں۔ پاکستان کا حصول ایک مقصد تھا جسے ہم نے جدوجہد کر کے حاصل کر لیا۔ پاکستان کا حصول منزل نہ تھا مگر افسوس کہ ہم مقصد اور منزل کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور صرف پاکستان کو منزل سمجھ کر آرام سے بیٹھ گئے لیکن یاد رکھئے منزل کو پانے کے لئے مسلسل جدوجہد اور سعیٔ پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ اللہ تعالےٰ کا اٹل قانون ہے کہ جو قوم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرتی ان کے پاس خارج سے تبدیلیاں نہیں آیا کرتیں لیکن ہم نے اللہ تعالےٰ کے اس اٹل قانون سے کچھ اس طرح اعراض برتا کہ بجائے اس کے کہ ہم ان ستائیس اٹھائیس برسوں میں اسلامی قوانین کو عملاً متشکل کر کے دنیا کے سامنے مثال پیش کرتے، ہم زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے۔ انہی شعبوں میں سے ایک تعلیم کا شعبہ ہے جو کہ بہت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جس کی برکت سے اگر نوجوان نسل کی صحیح تربیت کی جائے تو وہ آگے چل کر قوم و ملک کے لئے باعثِ سعادت بن جاتے ہیں۔ لیکن اس شعبہ سے مجرمانہ تغافل کا نتیجہ ہے کہ ہمارا گریجویٹ نوجوان مسائل کو سلجھانے کی بجائے اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ میرے خیال کے مطابق یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ رٹنے کی حد تک محدود

ہوتا ہے اور کالج کی چار دیواری سے باہر آکر وہ سب کچھ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ عملی زندگی میں نہ تو اسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے کچھ مدد لی جا سکتی ہے۔ طالب علم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ڈگری حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ جہاں تعلیم کی حیثیت ڈگریوں تک محدود ہو وہاں تعلیم کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے اور ڈگری؟ ڈگری تو وہ چیز ہے جو کہ ہمارے کالجوں میں تھوک کے حساب سے بکا کرتی ہے اور پھر اسی پہ کیا بس۔ اب تو ہمارے کالجوں میں سیاست بھی داخل ہو گئی ہے۔ آئے دن کالج کی چار دیواری میں سیاسی جلسے ہوتے رہتے ہیں جس سے تعلیم کا رہا سہا سلسلہ بھی کٹ جاتا ہے۔ وہ طالع آزما لیڈر جسے حصولِ اقتدار کی کوئی اور سبیل نظر نہیں آتی وہ طالب علموں کی اس نا سمجھی سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور اسے سیاست کے دل خوش کن نعروں میں اپنی منزل نظر آتی ہے۔

ہمارا ملک بے عملی کے جس نازک دَور سے گزر رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص سوچے ہوئے ہے کہ بغیر کچھ کئے ہم اپنے اعلیٰ مقاصد تک پہنچ جائیں لیکن چونکہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرتا ہے جو اس کے ہاتھ آجاتے۔ یہی حال ہمارے طالب علموں کا تعلیم کے حصول کے سلسلے میں ہے۔ خواہ وہ محنت کریں یا نہ کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاس ضرور ہوں لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اچھی تعلیم کا کیا معیار ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے؟ اگر ہم اپنے موجودہ تعلیم کے آمدہ نتائج پر غور کریں تو صاف نظر آئے گا کہ ہم نے اس سلسلے میں کس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور یہ کہ ہمارا موجودہ طریقِ تعلیم کس قدر غلط، ناقص اور ضرر رساں ہے!

ہم طلباء سے تو یہ کہتے ہیں کہ اسلام دنیا کا سب سے اچھا دین ہے لیکن انہیں یہ نہیں بتاتے کہ اس دین کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ تمام مذاہب عالم سے بہترین ہے۔ ہم اسے بتاتے ہیں کہ ہم نے پاکستان اسلام کے نام پہ حاصل کیا تھا لیکن ہم نے انہیں نہیں بتایا کہ اسلام ہے کیا؟ اگر یہی اسلام ہے تو پھر دیگر مذاہب عالم اور اس میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ ہم علاوہ وہ کچھ کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں لیکن نام اسلام کا لیتے ہیں اور غرض یہ کہ ہم طلبا کو وہ کچھ پڑھاتے ہیں جو کچھ ہم اسے کر کے نہیں دکھاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو قوم، ملک اور مذہب کے نام سے چڑ ہو جاتی ہے اس کے جوش اور ولولے سرد پڑ جاتے ہیں اور وہ ایک بے حس و حرکت مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بظاہر اچھے بھلے تندرست نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کے دل میں جھانک کر دیکھا جائے یا ان کے خیالات پڑھ لئے جائیں تو معلوم ہو گا کہ ان کے احساسات، جذبات جوش اور ولولے سب مر سے چکے ہیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ایک قوم ذلت کی گہری وادیوں میں گر جاتی ہے۔ اگر قوم و ملک کے روحِ رواں نوجوان طبقے کی یہ حالت ہو تو اس سے بڑا اور جہنم کیا ہوتا ہے۔ جہنم میں بھی تو یہی ہوتا ہے نا کہ انسان میں مزید آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ جمود کے بحرِ عمیق میں گر جاتا ہے لیکن طلوعِ اسلام جمود و سکوت کی اس دنیا میں یہ کہہ کر ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ "اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ، کچھ ہاتھ پیر چلاؤ، ابھی تک وہ ساعت" نہیں آئی ہے کہ جب وہ آتی ہے تو آکر نہیں ٹلتی اور یہ کہ پھر اس کے بعد کوئی سعی و عمل کام نہیں آتی"۔

میں آخر میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسانی بچہ (CLEAN SLATE) لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اب یہ ماحول

پر منحصر ہے کہ وہ اس کو جیسا چاہے بنا دے۔ اس سلسلے میں تدریسی اداروں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر مدرسے میں اس کی صحیح طریقے سے تربیت کی جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی ذات پر اس کے خوشگوار اثرات پڑتے ہیں بلکہ وہ اپنے معاشرے اور ماحول کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے اور اگر یہی درسگاہیں اس کی صحیح خطوط پر نشو و نما نہ کر سکیں اور اس کی تربیت کا اچھا انتظام نہ کریں تو ان کی صلاحیتیں برباد ہو جاتی ہیں اور برادرانِ عزیز! بلاشبہ پھر وہ درسگاہیں، درسگاہیں نہیں بلکہ مذبح خانے بن جاتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں اکبر الہ آبادی کو کہنا پڑا کہ ع

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

۱۰۔ محمد احمد

صدرِ محترم و معزز خواتین و حضرات! کسی قوم کی نئی نسل کے معاملہ میں سب سے بنیادی اور اہم ترین مسئلہ اس کے سیرت و کردار کی صحیح صحیح تعمیر کا ہے۔ سیرت و کردار کی یہ تعمیر ان مستقل اقدارِ حیات کے سانچے میں ڈھل کر تکمیل پاتی ہے جنہیں نظریات و تصورات اور معتقدات کی حیثیت سے زندگی کے سفر میں قبول کیا جاتا ہے۔ اس نہج پر نوعِ انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ وہ جو زندگی کو خالص مادی حد تک تسلیم کرتا ہے اس کا نقطۂ نظر چکبستؔ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب　　موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

یعنی کچھ مادی عناصر میں ربط باہمی پیدا ہوا تو زندگی وجود میں آگئی اور اس ربط باہمی میں انتشار رونما ہوا اور تارِ نفس کا سلسلہ ٹوٹ گیا تو موت واقع ہو گئی۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ ہے جس کے نزدیک زندگی محض مادی شے نہیں یہ طبعی موت کے جھٹکوں سے ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک جوئے رواں دواں کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس کے سامنے کالے کوسوں کی منزلیں ہیں یہ منزلیں ستاروں کی گزرگاہوں سے بھی کہیں آگے ہیں۔ اس دنیا کی زندگی کا مختصر سا دور بڑی حد تک زیادہ منزلِ مراد کی تیاری کا دور ہے اور مستقل اقدار کے سہارے یہ اپنے کٹھن مرحلے طے کرتی حیاتِ جاوید کے انعام سے سرفراز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حیاتِ جاوید کی اس منزل کے راہی جنہیں جماعتِ مومنین سے تعبیر کیا جاتا ہے اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتے ہیں کہ زندگی کے اس تصور کے لئے مستقل اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ اقدارِ حیات خارج سے ملتی ہیں اور بذریعہ وحی انبیائے کرام کی وساطت سے نسلِ انسانی کو عطا کی جاتی ہیں۔ خدا کے یہ برگزیدہ نمائندے نہ صرف نوعِ انسانی کو زندگی کی ان مستقل اور ابدی قدروں سے بہرہ ور فرماتے ہیں بلکہ ان کی اساس و بنیاد پر ایک نظامِ معاشرہ بھی متشکل کرتے ہیں۔ یہی وہ نظامِ معاشرہ ہوتا ہے جو نہ صرف لٹے پٹے شرفِ انسانی کو بحال کرتا ہے بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس سیرت و کردار کے محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھالتا ہے جس کی بدولت انسانی زندگی حیاتِ جاوید کی منزلِ مراد پانے کے قابل ہو جاتی ہے۔

زندگی کو خالص مادی حد تک تسلیم کرنے والا گروہ زندگی کے مادی تصورات کے تحت اپنی پوری جد و جہد اور سعی و کاوش مادی تقاضوں کی بجا آوری تک محدود رکھتا ہے۔ اچھی خوراک، اچھا لباس، زندگی کی مادی لذتوں سے بہرہ یاب ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ دوڑ دھوپ۔ یہ میسر آگئیں تو زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ جو اس راہ میں آگے بڑھا اور تسخیرِ کائنات کا عزم لے کر چاند تاروں پر کمندیں ڈالنی شروع کر دیں تو مقامِ آدم تک پہنچ گیا اور ملائکہ اس مقام پر اس کے حضور سجدہ ریز ہو گئے یعنی کائناتی قوتوں نے اس کے

سامنے ہتھیار ڈال دئیے۔ اس نے طوفان خیز دریاؤں کو زنجیریں ڈال دیں، سمندروں پر تسلط جما کر ان کا سارا غرور توڑ دیا۔ ہواؤں، بجلیوں اور آوازوں کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے کر ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر اور کمپیوٹر اور راکٹ ایجاد کر ڈالے۔ چاند تاروں اور زہرہ و مریخ تک پہنچ گیا۔ یہ "مقام آدم" بڑا ہی قابلِ فخر شے ہے۔ اسے پائے بغیر "مقام مومن" تک پہنچنے کا تصور بھی خود فریبی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ضرور پیشِ نظر رکھئے کہ آدم کی جنت چھین جا یا کرتی ہے۔ جنت وہی جاوداں ہے جو مومن حاصل کرے۔ آج کے آدم کی جنت تو ایک بٹن دبانے سے جہنم کے شعلوں میں تبدیل ہو جائے گی جس میں چیخیں، فریادیں، لٹی ہوئی عصمتیں اور انسانی لاشوں کے تعفن کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس قسم کے حالات میں اگر کوئی یہ کہے تو حق بجانب ہوگا کہ ؎

آج کے دور کا انسان بنایا جس نے
وہی میرا بھی خدا ہو، مجھے منظور نہیں

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ مغرب نے تسخیرِ کائنات کی منزلوں پہ قدم بڑھا کر "مقام آدم" تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن زندگی کو محض مادی حقیقت سمجھ لینے کی غلط فہمی اور کم نگہی میں ان مستقل اقدارِ حیات سے محروم ہو گیا جو زندگی کے سرچشمے سے بذریعہ وحی عطا ہوتی ہیں اور انہی کو زندگی میں منعکس کر لینے سے اس ایمان کے تقاضے تکمیل پاتے ہیں جس سے مغرب محروم ہے اور جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا ہے۔

معزز سامعین! خدا کی بارگاہ سے عطا فرمودہ اقدار پہ ایمان لانے سے وہ سیرت و کردار جنم لیتا ہے جس کی بدولت ایک طرف افراد انسانی ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں اور دوسری طرف وہ تسخیرِ کائنات کی نفع بخشیوں کو پوری نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے منشائے خداوندی کے مطابق اس طرح عام کر دیتے ہیں کہ خدا کی زمین پر جنتِ ارضی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ حبش کے بلالؓ اور روم کے صہیبؓ، قریش کے سرداروں کے پہلو بہ پہلو ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ دولت و رزق کے سرچشموں پر سے قارونوں کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

معزز خواتین و حضرات! یہ تھی وہ تعلیم جو چودہ صدیاں قبل دی گئی تھی اور ساتھ ہی کائنات کے نشوونما دینے والے احکم الحاکمین نے جماعتِ مومنین کے آنے والے قافلوں کو عروج و زوال کے اساسی نقطے سے خبردار کرتے ہوئے ایک انتباہ کیا تھا۔ بڑا ہی حقیقت کشا اور عبرت انگیز انتباہ۔ سنیے اور سوچئے کہ یہ کہیں ہماری اپنی ہی داستان تو نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (16/92)

(دیکھنا اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جانا جو سارا دن محنت کر کے سوت کاتتی رہی اور پھر شام کو اسے خود ہی تار تار کر کے رکھ دیا)

گذشتہ کئی صدیوں میں اس محنت سے کاتے ہوئے سوت کا جو حشر ہوتا رہا۔ اس کی داستانِ غم چھیڑنے کا وقت نہیں۔ صرف اس کا جائزہ لیجئے کہ مارچ سن ۱۹۴۱ء سے قراردادِ پاکستان کے نام اور لا الٰہ الا اللہ کے ورد سے ہماری دس کروڑ قوم نے جو سوت کاتنا شروع کیا تھا اور مایوسیوں کی اندھیری رات میں بھی یہ جانفشانی اور عرق ریزی جاری رہی تھی۔ اسے طلوعِ فجر کے ساتھ ہی ہم نے کس طرح اپنے ہی ہاتھوں بکھیر کر رکھ دیا۔ یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ ہماری تاریخِ حاضرہ کی سب سے دردناک داستان ہے۔ یہ داستان پاکستان کے

بخشیش میں ملے ہوئے فردوس میں ہر طرف بکھری پڑی ہے اور جو کچھ ہم نے اس قدر محنت سے کاتا تھا۔ اس کا تار پود صحنِ چمن میں اس طرح پریشان ہو چکا ہے جس کی مثال کسی ہوشمند قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

نظریہ پاکستان کی تعبیر تحریکِ پاکستان کے دوران لا الٰہ الا اللہ کے نعرے سے کی گئی تھی۔ اس نعرے نے عوام کو یہ حقیقت سمجھائی تھی کہ نظریہ پاکستان کا مطلب اس مملکت میں صرف خدا کی منشا کو پورا کرنا ہے۔ اسی احکم الحاکمین کی بارگاہِ عظیم کو اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ تسلیم کرنا ہے۔ اس حقیقت پہ ایمان لانا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں صرف خدا کے قوانین کی کارفرمائی قبول کی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی میری ذاتی موشگافی نہیں بلکہ بانیٔ پاکستان نے عثمانیہ یونیورسٹی میں پاکستان کی حقیقت سمجھاتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ:-

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارے کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول کی حدود متعین کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکومت ہے۔

محترز سامعین! سوچیئے کہ کیا اس سے زیادہ واضح، صاف اور واشگاف الفاظ میں نظریۂ پاکستان کی کوئی اور تعبیر ممکن ہے؟ ہمارے حکمران اور بر سرِ اقتدار سیاست دان اگر نظریۂ پاکستان کے معاملے میں ذرہ بھر دیانت دار ہوتے تو یہ الفاظ پاکستان کے ایک ایک چوراہے میں نمایاں طور پر کندہ کرا دیئے جاتے حکومت کے ایوانوں کی پیشانیاں ان الفاظ سے جگمگا رہی ہوتیں۔ قومی پارلیمنٹ کے صدر دروازے پر یہی حقیقت جلوہ گر ہوتی۔ سرکاری دفتروں اور عدالت ہائے عالیہ کی دیواروں پہ یہی یادگار کتبہ شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کر رہا ہوتا۔ ہمارا نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم انہی الفاظ سے مزین ہوتے۔ نوجوانوں کی تعلیم کا مرکز و محور یہ الفاظ ہوتے۔ نئی نسل آزادی کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہوتی۔ انہیں زندگی کے مقصود و منتہا کی خبر ہوتی۔ ان شاہین بچوں کو ان کی کھوئی ہوئی منزل نصیب ہو جاتی۔ ارضِ پاک خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی۔ اس روشنی میں زندگی کی پیچ در پیچ راہیں اُبھر اور نکھر کر اندھی اور بہری قوم کے سامنے آ جاتیں۔ وطن کی گلیوں سے ایک ایک ذرہ گوہرِ تابدار بن کر باہر آتا۔ اس طرح قوم کو ماضی کے شہ نشان مل جاتے۔ مستقبل کی منزلِ مراد کا سراغ مل جاتا۔ فریب مسلسل کی ماری ہوئی یہ قوم ایک بار پھر زندہ ہو جاتی اور زمین و آسمان اس کی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی پہ تحسین و تبریک کے زمزموں سے گونج اٹھتے۔

لیکن محترز سامعین! اس سے آمروں کی آمریت کیونکر برقرار رہتی۔ محلاتی سازشوں کے چور دروازے کس طرح کھل سکتے۔ استبداد کا نیا دَور کیوں کر جنم لیتا۔ نواب زادوں کی مہرہ بازیاں کیسے پروان چڑھتیں۔ سرحدی گاندھی کے پختونستان کے نعرے کیونکر وجۂ جواز پاتے۔ جی، ایم سید حضور رسالت مآب ﷺ کی ناموس پر حملہ آور کیوں کر ہو سکتا۔ مجیب الرحمٰن مشرق اور مغرب کے ماں جائے بھائیوں کو علیحدگی اور منافرت کا سبق کیونکر سکھا سکتا۔ ارضِ پاک میں سامراج اور اشتراکی خداؤں کے کلمے کیسے پڑھے جاتے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا۔ ہوتا

چلا آیا اور برابر ہو رہا ہے کہ نظریہ پاکستان کا دل کش مفہوم جو قائداعظمؒ نے بتایا تھا۔ اس طرح نگاہوں سے اوجھل کیا گیا کہ ہم ان فرعونوں کے حق میں نعرے ہی بلند کرتے رہے۔

صدرِ محترم! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ملّتِ پاکستان کے خلاف اگر کوئی سب سے بڑی ابلیسی سازش ہوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ اس ملّت کی نئی نسل کو وہ کچھ نہیں بننے دیا گیا جو وقت کی ضرورت تھی جو حالات کا تقاضا تھا۔ اگر اس نئی ملّت کے ننھے شاہ باز اپنے جذب دروں سے محروم نہ ہوتے۔ ان ابھرتے ستاروں کی تنک تابی اور سوزِ تمنا کی حرارت نہ چھینی جاتی، تو اس قوم کو وہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے جو دیکھ چکی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت کیا گیا۔ ورنہ وہ کون سا امر مانع تھا کہ اس مملکتِ خداداد کا نصابِ تعلیم قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مدوّن نہ ہو سکا۔ اس کا نظامِ تعلیم قرآن کے سانچے میں نہ ڈھالا جا سکا جب ہم سب پرانے بندھن توڑ کر نئے عزائم اور نئے ولولوں سے لیس ہو کر آگے بڑھے تھے تو پھر مغرب کے مادی نظریہ حیات کی بنیادوں پر متشکل نصابِ تعلیم کیوں اپنایا گیا؟ جس کی رُو سے زندگی کا مقصد وحید (EAT DRINK AND BE MERRY) کے سوا کچھ نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا صدقہ ہے کہ پوری کی پوری قوم مفادِ عاجلہ کے پیچھے بھاگ رہی ہے نئی نسل کے سامنے نہ کوئی نصب العین حیات ہے اور نہ انسانیت کی بلند اقدار کا تصور۔ اخلاق باختہ استاد اور انسانیت سے عاری شاگرد۔ درسگاہوں کی جلوت میں وہ کچھ ہو رہا ہے جو شریف معاشرہ کی خلوت میں بھی معیوب قرار پاتا تھا۔ مفادِ عاجلہ کی خاطر شرفِ انسانیت تیاگ دیا گیا۔ اخلاق باختگی کے مظاہرے۔ چند مراعات کی خاطر ضمیر کی سودا بازی، عصمتوں کا بیوپار۔ کیا کچھ نہیں ہو رہا اس نظامِ تعلیم میں۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جائز قربانیاں ناجائز وسیلوں کی دھندلکوں میں چھپ گئیں۔ حوصلے، عزم اور اعتماد کو لالچ اور بیزاری نے ڈھانپ لیا۔ اسلامی اقدار کی بجائے ذاتی مفاد کا تحفظ پیشِ نظر رہا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو لوگ ملّتِ پاک کے سرمایہ حیات کے وارث بن کر اس پر مسلّط ہوتے چلے آئے انہیں خدا، رسول، اسلام، پاکستان اور نظریہ پاکستان سے کہیں بڑھ کر اپنی ذاتی ہوسناکیاں عزیز تھیں۔ لوٹ کھسوٹ کا چنگیزی جذبہ عزیز تھا۔ عوامی امنگوں کے گل و گلزار کو شکارگاہ بنانا مقصود تھا۔ یہ سب ملّت کے قائد، محافظ اور سرپرست بن کر طبلہ بانگ دہلوں کے جلو میں اپنے عشرت کدوں سے نمودار ہوتے رہے اور خدا کی کارفرمائی سے پوری طرح بے خوف رہ کر اپنی ہی قوم سے وہ بدترین سلوک کرتے رہے جو کسی فرعون نے بھی نہیں کیا ہو گا؟ ؎

کب تک فریب کھائیں گے ان رہبروں سے ہم
ہے منزل تو کیا؟ نشاں بھی نہ منزل کا مل سکا

معزز سامعین! اس امر پر غور کیجئے کہ نظریۂ پاکستان کے مفہوم سے عوام الناس کو کیوں بے خبر رکھا گیا پاکستان کے حصول کے مقصد کو کیوں پس پشت ڈال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ابلیسی سازش تھی جس میں اس ملک کی قارونیت، فرعونیت اور ہامانیت برابر کی شریک تھی کیونکہ قرآنی مملکت میں ان تینوں میں سے کسی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ قرآن ہر قارون کے وجود کو دھرتی پر بوجھ سمجھ کر زمین کی گہرائیوں میں دھنسا دیتا ہے۔ نہ کسی فرعون کو قرآن برداشت نہیں کرتا۔ اسے گہرے پانیوں میں ڈبو دیتا ہے اور ہامانوں کی نگاہ و فریب رسیوں کو صاحبِ ضربِ کلیمی کا اژدھا نگل جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اور بآنگِ دہل کہتا ہوں کہ اگر یہ طاغوتی طاقتیں ہمارے نوجوانوں کو نظریۂ پاکستان

سے بے خبر رکھنے میں کامیاب نہ ہوتیں، تو کوئی ولی خان کوئی عبدالغفار خان ان میں پختونستان کا ڈھونگ نہ چلا سکتا - کوئی مجیب الرحمن مشرقی پاکستان کے عوام کو مبتلائے فریب کر کے بنگلہ دیش بنانے میں کامیاب نہ ہو سکتا - کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ علاقائی عصبیتوں کا پرچم بلند کر کے عوام میں منافرت کی آگ پھیلا دے - کسی نوجوان کو جرأت نہ ہوتی کہ بھری محفل میں یونیورسٹی کے سٹیج پر سندھو دیش زندہ باد کا نعرہ لگائے - یقین مانئے اس وقت ملک میں جس قدر نو بہ نو مسائل جنم لے رہے ہیں ان کا بنیادی سبب اسی نشانِ منزل سے نئی نسل کی بے نصیبی ہے - اس بے نصیبی کا نتیجہ ہے کہ پوری قوم بے بسی اور بے یقینی کے دلدل میں پھنس کر رہ گئی -

صدرِ محترم! کسی قوم کی بقا کے لئے خطرہ، مصائب و آلام نہیں ہوا کرتے بلکہ اس قوم کا اجتماعی اور انفرادی بے بسی کا شکار ہو جانا ہوتا ہے - علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

معزز خواتین و حضرات! میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بازآفرینی کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ ہمارے نصابِ تعلیم کو قرآن کی چوکھٹ میں فٹ کر دیا جاتا - اسی کے مطابق نئی نسل کی تربیت ہوتی - اس تربیت سے نئی نسل کے شاہبازِ زندگی کی فضائے بسیط میں جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی عقابی تب و تاب سے بہرہ ور ہوتے - ارضِ پاک خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی - اور اس طرح فریبِ مسلسل کی ماری ہوئی یہ قوم ایک بار پھر زندہ ہو جاتی -

مگر حکومت کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے گھناؤنے پن نے ان ابھرتے ستاروں سے سوزِ تمنا کی حرارت اور تنک تابی تک چھین لی - انہیں جذبِ دروں سے محروم کر دیا - وہ اس انوکھی تعلیم کے صدقے میں اپنی راہ و منزل تک سے بے نصیب ہو کر رہ گئے - جذبِ دروں اور ذوقِ پرواز سے محروم ہو کر ان کے بازو سمٹنے لگے، تو کارگہِ سیاست کے شکاریوں نے ان کے جذبات کی گرما گرمی کو اپنے کام میں لانے کے لئے اپنی کمندیں اور جال پھینکنے شروع کر دئیے - نئی نسل سے منزل چھین کر انہیں آوارہ گردی پر چھوڑ دیا گیا - اس کے لئے انہیں خود ساختہ اور زرخرید لیڈرشپ مہیا کرنے کی کوشش کی گئی - سامراجی طاقتوں کی مصلحت کوشیاں اپنے خفیہ ہاتھوں کو الگ کام میں لے آئیں - زرخرید لیڈرشپ کو کروڑوں روپوں بلکہ سکوڈروں تک کے نمائشی کردار سے نوازا گیا اور اس کے نتیجے میں مستقبل کے معماروں کو ایسے ایسے انجانے تخریبی محاذوں پر ہراول دستے بنا کر بھیجا گیا کہ اس سے کارواں کا رخ بدل گیا اور منزلِ مراد کا سراغ نہ مل سکا -

صدرِ محترم! ہماری نظریاتی قیادت کے مدعی اپنے اپنے مجرمانہ کردار کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کی عیب جوئی اور اپنی پاک بازی کی افسانہ نوازی میں بددیانتی کی پست ترین سطح پر پہنچ گئے ہیں اور آج جس اشتعال انگیز اور منافرت خیز سیاست بازی اور نظریات بازی سے ارضِ پاک جہنم کے جن شعلوں میں تبدیل ہو چکی ہے اس میں اگر سوشلسٹوں کا ہاتھ ہے تو جماعتِ اسلامی کے اسلام پسند ان سے چار قدم آگے ہی ہیں، بلکہ وہ تو قرآن کو بھی آگ لگانے سے نہیں چوکتے - صرف اپنی مطلب برآری کے لئے - اپنے مقاصد کے حصول کے لئے - اس کے لئے ان کے مذہب میں ہر ناجائز حربہ استعمال کرنا جائز ہی نہیں واجب ہو

(باقی صفحہ ۶۷ پر)

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا

- ترجموں سے کیونکہ قرآنی الفاظ کے مترادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔
- تفسیروں سے کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر مفسروں کے اپنے خیالات اور معتقدات قرآنی مطالب پر غالب آجاتے ہیں۔
- قرآن مجید اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔

مفکر قرآن پرویز صاحب نے چالیس سال کی محنت شاقہ سے پہلے اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اسکے بعد پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے متعین کیا ——— جو

مفہوم القرآن

کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

- مفہوم القرآن (مع متن) موتیوں کی طرح ترشے ہوئے نستعلیق میں بلاک کے ذریعے عمدہ سفید دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تین نہایت مضبوط، خوبصورت سنہری جلدوں پر مشتمل ہے۔ ضخامت پندرہ سو صفحات۔
- قیمت، جلد اوّل پینتیس روپے جلد دوم پینتیس روپے جلد سوم چالیس روپے مکمل سیٹ ایک سو دس روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور